اشفاق احمد

بے نیاز صوفی بابا

محمد شاہد

فہرست مضامین

- حرفِ آغاز ---------------------- پروفیسر امجد علی شاکر 7
- اشفاق احمد ——— بے نیاز صوفی بابا ---------------------- ممتاز مفتی 9
- پی ٹی وی سے نشر ہونے والے پروگرام ''زاویہ'' میں سے اشفاق احمد کے چند منتخب پروگرام ---------------------- 21
- اللہ والے لوگ ---------------------- 21
- نیک خواہشات ---------------------- 29
- خدا کس کی سنتا ہے! ---------------------- 35
- احساس ---------------------- 42
- بلوچوں کا ڈیرہ ---------------------- 50
- مَیں، نور جہاں اور 1965ء کی جنگ ---------------------- اشفاق احمد کی زبانی 56
- انٹرویوز ---------------------- 62
- ادب، صحافت، سیاست اور معاشرت پر اشفاق احمد سے طویل گفتگو ---------------------- 62
- ''ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے'' ---------------------- 104
- اشفاق احمد سے آخری انٹرویو ---------------------- 119
- اشفاق احمد کے منتخب افسانے ---------------------- 124
- عجیب بادشاہ ---------------------- 124
- کایا پلٹ ---------------------- 137
- بدلی سے بدلی تک ---------------------- 157

- تنقید اور تائی کا فلسفہ ---- اشفاق احمد ---- 163
- سارہ اینڈرسن کے نام ---- اشفاق احمد ---- 169
- والٹن کیمپ اور پیر کامل ---- اے حمید ---- 171
- میرے مرنے کے بعد کیا ہوگا۔۔۔؟ ---- اشفاق احمد ---- 176
- اشفاق احمد ـــــ ایک داستان گو ---- 187
- تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں ---- اشفاق احمد ---- 191
- وہ تو ایک زمانہ تھا ---- 194
- بلبل ہزار داستان ---- 198
- کاش اشفاق احمد جیسی کوئی اور شخصیت ابھرتی نظر آئے ---- 201
- اشفاق صاحب ---- 206
- لیکچرار سے تلقین شاہ تک ---- 209
- ایک اشفاق اور سو افسانے ---- 211
- اشفاق احمد ـــــ چند یادیں ---- 214
- اشفاق صاحب ـــــ زندگی کے چند ناقابل فراموش پہلو ---- 218
- سب سے بڑا داستان گو چلا گیا! ---- 220
- بُلبل خاموش ہوگیا! ---- 224
- داستان سرائے کا دِیا ---- 229
- اشفاق احمد ـــــ داستاں گو، داستاں کہتے کہتے سوگیا ---- 232
- کون گلی گئے شام۔۔۔؟ ---- 236
- گڈریا شاہ ---- 239
- اشفاق احمد مرا نہیں۔۔۔! ---- 243
- رابطہ جو ٹوٹ گیا ---- 246

☆☆☆

حرفِ آغاز

اشفاق احمد ایک افسانہ نگار تھا جس نے گڈریا لکھا تھا۔ پھر وہ گڈریا ہو گیا۔ سوٹی اُس کے کاندھے پر تھی اور بھیڑوں کے لیے کلمۂ خیر اُس کی زبان پر تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ کلمے بہت سے ہوتے ہیں۔ وہ بولتے ہوئے صرف خیر کے کلمے بولتا تھا۔ وہ کلمے جو دوسروں کے لیے خیر کا ذریعہ ہوں اور اُس کے اپنے لیے بھی خیر و عافیت کی پناہ گاہ۔ ان سے کوئی حاکم ناراض نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ کلمۂ خیر تو بولتے تھے، مگر ایسا کلمۂ حق بولنے سے گریز کرتے تھے جس سے حاکم کی جبیں پر شکن آئے اور ان کی زندگی پر۔ اکثر اہل حق کلمۂ حق کہتے ہیں، خصوصاً ظالم حاکم کے خلاف کلمۂ حق بہت شوق سے کہتے ہیں، مگر ظالم حاکم سے پوچھ کر اور اُس سے معاملہ طے کر کے۔ اشفاق اس قسم کے مُک مُکا کا قائل نہیں تھا۔

اشفاق احمد نے اُردو سائنس بورڈ میں نوکری کی۔ بائیسویں گریڈ تک پہنچا، حالانکہ یہ گریڈ صرف بیوروکریٹوں کے لیے مخصوص ہے۔ اشفاق کی فقیری اسے اس مقام تک لے گئی۔ پھر بھی وہ فقیری کی ڈفلی بجاتا رہا اور کسی نے اُس پر اعتراض نہ کیا۔ سرکاری ملازمت کا کمال یہ ہے کہ بندہ کلمۂ خیر اور کلمۂ حق کا فرق سمجھ جاتا ہے۔ وہ کلمۂ حق کہنے کا بھی سلیقہ سیکھ جاتا ہے۔ اُسے پتا ہے کہ کلمۂ حق ذرا مشکل ہو تو حاکم تو کیا افسر بھی سمجھ نہیں پاتے۔ مارشل لاء کے زمانے میں سنسر بورڈ والے پیش ہونے والی تحریر میں سے ہر وہ فقرہ کاٹ دیتے ہیں جس کے معنی ان کی سمجھ سے بعید ہوں۔ حکمران عام حالات میں ایسے فقروں کو دانشورانہ فقرے سمجھ کر بندے کو عالم فاضل سمجھ لیتے ہیں۔ اشفاق تو بہر حال عالم فاضل تھے۔

ان دنوں ہمارے ہاں ہر کالم نگار دانشور بھی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ کالم لکھنا سائیکل چلانا ہے کہ سیکھ لیا تو بس چلاتے رہے۔ چاہے پشاور سے کراچی تک سائیکل چلا لیا، چاہے بہتر گھنٹے مسلسل سائیکل چلا لیا۔ نتیجہ ایک ہی ہے۔ کالم لکھنے کا نتیجہ بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی بندہ دانشور کہلاتا ہے چاہے وہ نان رائٹر ہی کیوں نہ ہو۔ واضح رہے کہ ہمارے ہاں سارے نہ سہی اکثر کالم نگار رائیٹر ہی تو ہیں۔ اشفاق احمد رائیٹر تھے، اس لیے کالم نہیں لکھتے تھے۔ ریڈیو ٹاک لکھتے تھے۔ آخری عمر میں ٹی وی ٹاک پر گذارہ کرنے لگے۔

ریڈیو ٹاک اور ٹی وی ٹاک کا کسی نے ایک عمدہ نسخہ بتایا تھا کہ جونہی بات آگے بڑھانا مشکل ہوا، اقبال، قائداعظم یا اسلام ڈال دیا۔ اشفاق بات کرتے کرتے جونہی کسی بات میں الجھتے بات میں ایک بابا ڈال دیتے۔ یہ اشفاق احمد کی دانشوری کا کمال تھا کہ اس نے کئی بابے تخلیق کیے، جوان کے ساتھ ہی فوت ہو گئے۔ ان کی تحریروں میں صرف ایک بابے کا زندہ کردار ملتا ہے، وہ بابا فضل شاہ نور والے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ اصلی بابے تھے، باقی سارے اُن کا سایہ تھے۔

اشفاق احمد کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک زمانے میں گڈریا لکھا تھا۔ پھر وہ ایسا افسانہ نہ لکھ سکے۔ گڈریا لکھتے ہوئے انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس افسانے سے کون خوش ہوگا اور کون ناراض۔ اس کی ادب کے بازار میں کیا قیمت ہوگی۔ اس کو پڑھ کر ان کا فائدہ ہوگا یا نقصان۔ اس کے بعد وہ ان باتوں کو بھول نہیں سکے۔ گڈریا کیسے لکھتے وہ افسانہ لکھنا جانتے تھے۔ اس لیے وہ افسانہ لکھتے نہیں سناتے تھے۔ داستان کی طرح، لفظ لفظ، قدم قدم آگے بڑھتے تھے، بس چلتے چلتے راستے میں انہیں وقت اور وقت کا حکمران یاد آ جاتا اور وہ اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ گڈریا راستہ بھول جاتا۔ وہ کلمۂ خیر تو کہتا، مگر کسی سے یہ نہ پوچھتا کہ کون سا کلمہ پڑھوں۔ وہ کاندھے پر لاٹھی اٹھائے کلمۂ خیر کا ورد کرتا آگے بڑھ جاتا۔ کلمۂ شہادت دور ہو جاتا۔ وہ کسی سے یہ پوچھنا بھی بھول جاتا کہ کون سا کلمہ پڑھوں۔

اشفاق نے گڈریا لکھا۔ پھر لکھتا رہا، لکھتا رہا، مگر گڈریا نہ لکھ سکا۔ افسانہ لکھے، ڈرامے لکھے۔ ٹی وی ٹاک لکھی۔ ریڈیو پر لکھا۔ پرفارم کیا، مگر گڈریا نہ لکھ سکا۔ تاؤ جی کاندھے پر لاٹھی رکھے اشفاق سے اُردو جملوں کا فارسی ترجمہ پوچھتے رہے۔ اشفاق بتاتا رہا۔ گڈریا نہ لکھ سکا۔ بابے لکھے، مگر کوئی بابا گڈریا نہ بن سکا۔ ہاں اتنا ڈھیر سارا لکھنے کے بعد وہ ایک اور افسانہ لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ گڈریا سے بڑا۔ تاؤ جی سے پیچیدہ ان جیسا یا ان کے قریب قریب کردار بھی تخلیق کر لیا وہ افسانہ قاش قاش بکھرا ہوا کتنی کہانیوں کے عنوان سے، کتنے ناموں سے چھپا، نشر ہوا، مگر اس کا عنوان تو اب سامنے آیا۔ اس افسانے میں ایک بڑا کردار ہے۔ کمال پیچیدہ، کمال منفرد اور کمال کا تخلیقی کردار، اس کردار کے قاش قاش افسانوں کے سارے عنوان آہستہ آہستہ مدھم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دن سارے عنوان مٹ جائیں گے اور ان ساری تحریروں کا اک عنوان ہوگا۔ شاید یہ عنوان بھی ''گڈریا'' ہی ٹھہرے۔ اشفاق کے کردار کی کہانی کے لیے اس سے اچھا عنوان اور کیا ہوگا۔

[پروفیسر امجد علی شاکر]

ممتاز مفتی

اشفاق احمد ——— بے نیاز صوفی بابا

اشفاق احمد کھاتے پیتے پٹھان گھرانے میں پیدا ہوا۔ بہت سے بھائیوں میں ایک کے سوا سب سے چھوٹا۔ باپ ایک قابل محنتی اور جابر پٹھان تھا جس کی مرضی کے خلاف گھر میں پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ گھر کا ماحول روایتی تھا۔ بندشیں ہی بندشیں۔ اس کے باوجود اشفاق کی شخصیت میں بنیادی طور پر پٹھانیت کا عنصر مفقود ہے۔

اشفاق احمد کی شخصیت میں دُکھ اور چپ کا عنصر میرے لیے ایک معمہ ہے چونکہ میں نے زندگی میں آج تک اشفاق احمد سا کامیاب آدمی کہیں نہیں دیکھا۔

اس نے جوانی میں روایت توڑ محبت کی۔ اسے اچھی طرح علم تھا گھر والے کسی غیر پٹھان لڑکی کو بہو بنانے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ گھر میں اپنی محبت کا اعلان کرنے کی اس میں کبھی جرأت پیدا نہ ہوگی۔ اس کے باوجود ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ محبت میں کامیاب ہو گیا۔

شادی کے بعد مجبوراً اسے گھر چھوڑنا پڑا۔ اس وقت وہ بے سہارا تھا بے وسیلہ، گھر کا چولہا جلانے کے لیے مجبوراً اسے سکرپٹ رائٹر بننا پڑا۔ اس زمانے میں سکرپٹ رائٹنگ کی اس قدر مانگ نہ تھی کہ گزارہ ہو سکے۔ اشفاق احمد کو اس کاروبار میں صرف کامیابی حاصل نہیں ہوئی بلکہ شہرت بھی ملی۔ بے شک اشفاق نے جدوجہد کی، محنت کی۔ لیکن محنت کامیابی کی ضامن نہیں ہوتی۔

تقسیم کے بعد جب میں اسے پہلی مرتبہ ملا تو وہ بنیادی طور پر وہی کچھ تھا جو آج ہے۔ دُکھ اور چپ کے تار و پود سے بنا ہوا ٹاٹ جس پر یہاں وہاں سنہرے تاگے سے کاڑھی ہوئی پُھل پتیاں تھیں۔ آج بھی وہی ٹاٹ ہے۔ البتہ ٹاٹ پن کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ سنہری پھل پتیوں کی چمک زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ ٹاٹ اور سنہرے پن کا تضاد زیادہ واضح ہو گیا ہے۔

ان دنوں میں بمبئی سے آیا ہوا مہاجر تھا۔ اپنے عزیزوں کو مشرقی پنجاب سے بچا کر لا چکا تھا۔ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ مہاجر کیمپ میں مقرر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

ایک روز کیمپ کے ایک ویران کونے میں جب میں حالات کی وجہ سے پریشان کھڑا تھا تو ایک چٹی سفید شگفتگی اور تازگی سے بھرپور مٹیار میرے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ آنکھیں چمکا کر بولی، آپ ممتاز مفتی ہیں۔

جی۔ میں نے جواب دیا۔

ہم نے آپ کی آپا پڑھی ہے۔

بہت اچھا کیا آپ نے۔

بولی میں ساتھ والے کیمپ میں ملازم ہوں کبھی اُدھر آیئے گا۔

جی اچھا۔ میں نے جواب دیا۔

بولی میرا نام اشفاق احمد ہے۔

پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر ایسے لگا جیسے گلابی مخمل پر سنہرے پھول کاڑھے ہوں۔

پھر اشفاق اور میں روز ملنے لگے۔

جوں جوں میں اس کے قریب آتا گیا مخمل ٹاٹ میں بدلتی گئی۔ سنہرے پھل، بوٹے اُبھرتے گئے۔ طوائف کی پسواج کبھی کبھی کھلنے لگتی اس لیے نہیں کہ اشفاق کے اندر کی طوائف بہت نمایاں تھی بلکہ اس لیے کہ وہ میرے اندر کی طوائف سے زیادہ بھڑکیلی تھی۔ ہر فنکار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں ننگی کسی میں ادھ کھلی کسی میں مستور مثلاً ابوالاثر میں بالکل ننگی تھی۔ محمد طفیل میں مستور ہے۔ انتظار میں ادھ کھلی ہے۔ اشفاق میں گھونگھٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ اس زمانے میں ہم لارنس باغ میں اوپن ایئر تھیٹر میں ملا کرتے تھے۔ اوپن ایئر تھیٹر ذوبی کے قبضے میں تھا۔ ذوبی اشفاق کا دوست تھا اور جانا پہچانا آرٹسٹ تھا۔ ذوبی خوش باش نوجوان تھا۔ انداز میں سنجیدگی تھی۔ بات میں پھلجھڑی تھی۔

اوپن ایئر تھیٹر میں پہنچتے ہی اشفاق کے اندر کا ڈرامائی نقالیہ باہر نکل آتا۔ پھر رنگین باتوں کے سنہرے جال ہوا میں اُڑتے۔ نقلیں ممکس، قصے کہانیاں چٹکلے، لطیفے، اشفاق احمد تماشا ہوتا ہم تماشائی ہوتے اور اوپن ایئر تھیٹر واقعی تھیٹر بن جاتا۔

اشفاق احمد ٹیلینٹڈ فنکار ہے۔ اس کی ٹیلنٹ کا مرکز آنکھ اور کان ہیں۔ خصوصاً کان۔ وہ مجھ سے زیادہ دیکھتا ہے، زیادہ سنتا ہے۔ اس کا ذہن ہر تفصیل کو ریکارڈ کر لیتا ہے اور اس کا نطق اسے من وعن ری

پروڈیوس کرسکتا ہے۔

ان دنوں اشفاق احمد ایک لق و دق جزیرے میں رہتا تھا جو رابنس کروزو کے جزیرے سے کہیں زیادہ ویران تھا۔ اشفاق احمد کا یہ جزیرہ ایک بہت کھلی نیم چھتی تھی جو ایک وسیع و عریض رستے بستے مکان کی اوپر کی منزل پر واقعہ تھی۔

جب بڑے خان گھر پر نہ ہوتے تو نچلی منزل میں اک میلا لگ جاتا شور شرابا، ہنسی مذاق لیکن نیم چھتی میں ہر وقت ہو کا عالم ہوتا۔ وہاں چاروں طرف کتابوں کے ریک بھرے ہوئے تھے جن میں رنگا رنگ کی کتابیں تھیں۔ ان کے درمیان فرش پر اشفاق احمد یا تو مطالعہ میں مصروف ہوتا اور یا مستقبل کے منصوبے بناتا جاگتے کے خواب دیکھتا۔

اس جزیرے کو دیکھ کر میں نے جانا کہ اشفاق احمد صرف دُکھ اور چپ ہی نہیں ازلی اکیلا بھی ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک جزیرہ ہے جو کسی کو کنارے لگنے نہیں دیتا۔ جو نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی تنہائی میں مخل ہو۔

سارا سارا دن وہ کتابوں کے انبار میں بیٹھا رہتا۔ بے نام دُکھ کا مارا ہوا۔ بے وجہ چپ۔ تلے دبا ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ ساری نیم چھتی ایک عظیم اکتاہٹ سے لبالب بھر جاتی۔ اس میں ایک وحشت بیدار ہوتی۔ لپک کر وہ سنہرے پھل بوٹوں والا چغہ پہن لیتا۔ چغہ پہنتے ہی چہرے کے زاویے اوپر کو اُبھر آتے۔ ہونٹوں پر روغنی تبسم کھلنے لگتا اور وہ چٹکیاں بجاتا ہوا نیم چھتی کی سیڑھیاں اترنے لگتا۔ پھر یہ خوش باش نوجوان اوپن ایئر تھیٹر میں جا پہنچتا۔ وہاں ڈگڈگی بجاتا۔ گھنگھرو چھنکاتا۔ مجمع لگاتا تھیلے سے رنگین باتوں کے جال نکالتا۔ گنگناتا۔ گاتا، ڈرامے کھیلتا، قہقہے لگاتا، خود ناچتا دوسروں کو نچاتا۔ لیکن یہ دَور زیادہ دیر کے لیے نہیں چلتا تھا۔ اس کے بعد پھر وہی جزیرہ وہی ہو حق، وہی دکھ، وہی چپ، وہی تنہائی، وہی اشفاق احمد۔ اس زمانے میں اشفاق کی زندگی اس خاتون کی طرح گزر رہی تھی جو سارا دن ننگے سر، ننگے پاؤں ان دھلے منہ اور لٹ پٹ بال لیے دھوپ میں بیٹھی ہونسیاں پانے میں لگی رہتی ہو اور شام کو ہار سنگار کر کے پسواج پہن کے طوائف بن جاتی ہو۔

پتہ نہیں فنکار کی تخلیق میں قدرت اس قدر اہتمام کیوں کرتی ہے۔ اپاہج بنا کر ناچنے کی انگیخت دیتی ہے۔ گونگا بنا کر باتوں کی پھلجھڑیاں چلانے پر اکساتی ہے۔ پتہ نہیں قدرت ایسا کیوں کرتی ہے۔ مگر یقیناً وہ ایسا کرتی ہے۔

اس زمانے میں ایک ویران نیم چھتی میں تنہائی دُکھ اور چپ کے بنیادی رنگوں سے قدرت ایک فنکار کی تخلیق کر رہی تھی۔

پتہ نہیں کن وجوہات کی بنا پر اشفاق احمد کی شخصیت میں ہفت رنگی عناصر پیدا ہو چکے ہیں۔ایک بے نیاز صوفی بابا۔رکھ رکھاؤ سے سرشار۔ایک دنیادار خودنمائی سے بھرپور ایک خاتون۔پتھر کا بنا ہوا ایک دیوتا۔دوسروں کو نصیحتیں کرنے پر پھبتیاں کسنے والا ایک تلقین شاہ۔اپنی منوانے والا گھر کا مالک۔سن کر جذب کر لینے والا ایک عظیم کان۔

اشفاق کے والد ایک عظیم شخصیت تھے۔اتنی عظیم کہ انھوں نے گھر کے تمام افراد کو کبڑا بنا رکھا تھا۔ان کی وجہ سے گھر میں بالشتیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جب یہ گلیور گھر ہوتا تو کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوتی۔گھر سے باہر ہوتا تو دھما چوکڑی مچ جاتی۔

بیگم اس سوچ میں کھوئی رہتی کہ عجز،ادب،احترام اور دنیاداری کا کونسا مرکب ایجاد کیا جائے جس کے زور پر ظلِ الٰہی کو ڈھب پر لایا جاسکے۔

خان منزل میں صرف پٹھان خصوصیات کی قدر و منزلت تھی۔چونکہ اشفاق ان خصوصیات سے محروم تھا۔اس لیے گھر میں وہ سب سے چھوٹا بالشتیا تھا۔

اشفاق میں انفرادیت کی ایک کلی لگی ہوئی ہے۔وہ چاہتا ہے کہ کوئی انوکھی بات کرے۔انوکھا کام کرے ،انوکھی خبر سنا کر دنیا کو حیران کر دے۔خان منزل میں اس کا یہ جذبہ تشنۂ تکمیل رہا۔دل میں ایک کانٹا سا لگا رہا۔ردعمل یہ ہوا کہ اب وہ کسی کو گلیور ماننے کے لیے تیار نہیں کسی پہلو سے خود کو بالشتیا تسلیم کرنے سے منکر ہے۔

اگرچہ وہ اپنی فنکارانہ عظمت کا تذکرہ خود نہیں کرے گا لیکن اس کا جی چاہے گا کہ دوسرا کرے۔دوسرا کرے تو اشفاق کے چہرے پر پھلجھڑیاں چلنے لگیں گی۔چہرے کے زاویے اوپر کو اُبھر آئیں گے آنکھوں میں تبسم پھوٹے گا۔

کسی دوسرے فنکار کی عظمت کی بات چھڑ جائے تو وہ بات کو کاٹے گا نہیں لیکن ہاں میں ہاں بھی نہیں ملائے گا۔اشفاق احمد کی شخصیت کے سادھوپن سے مجھے انکار نہیں لیکن اس کی فنکارانہ خاموشی کے گھونگھٹ تلے چھپے رہنے کے باوجود بڑی طوطا چشم ہے۔

اس جزیرے کی بوجھل تنہائی میں اشفاق احمد نے جو اظہار کا پہلا طریقہ آزمایا وہ مصوری تھا۔یہ ذوبی سے میل ملاپ کی وجہ سے تھا۔لیکن کچھ دیر کے بعد اس نے مصوری چھوڑ کر ادب کو اپنا لیا۔اور وہ مختصر افسانے لکھنے لگا۔

مصوری کا دور صرف تین چار سال رہا۔اس کے دو عمل مجھے ابھی تک یاد ہیں۔پہلے عمل کا نام کال

بیل تھا۔ تصویر میں نسائی جسم کا وہ برقی بٹن دکھایا گیا تھا جسے دبانے سے محترمہ رکھ رکھاؤ اور لاج کے پردے چاک کر کے باہر نکل آتی ہے۔ تصویر دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے باہر نکل آنے والی محترمہ دراصل ایک جن ہو جسے انسانی بوتل میں قید کر رکھا ہو۔

دوسرے عمل کا کوئی نام نہ تھا۔ ہوتا تو ''دی فالک درمن'' ہوتا۔ تصویر میں ایک عورت دکھائی گئی تھی۔ جس میں جنسی تقاضوں کی گٹھڑی کندھوں پر رکھی ہوئی تھی۔ اور وہ آرزوؤں کی ان مشکیوں کو برسرعام چھلکاتی پھرتی تھی۔

پتہ نہیں اشفاق احمد نے عمل نگاری میں جنس کا موضوع کیوں اپنایا۔ چونکہ اشفاق احمد کا جنس سے لگاؤ ضمنی ہے۔

جنس کے لحاظ سے مرد کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو جذبے کا دریچہ کھولے بغیر جنس کے ایوان میں چہل قدمی کے شوقین ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ کہ جب تک جذبات کا دروازہ نہ کھلے جنس کے خدوخال نہیں اُبھرتے۔ اور تیسرے وہ کہ جذبات کی کھڑکی کھل بھی جائے تو بھی جنس سے خائف رہتے ہیں۔ اشفاق احمد تیسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ ان دنوں اشفاق احمد کی آرزو تھی کہ شوخ اور طرح دار لڑکیوں کو باتوں کے جال بُن کر اپنی طرف متوجہ کرلے۔ متاثر کرلے۔ جب وہ تاثر سے بھیگ جاتیں۔ تو اشفاق پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ''اب کیا ہوگا'' اشفاق اب بھی عورت کے قرب سے ڈرتا ہے۔ قریب مت آؤ دور کھڑی ہو کر بات کرو۔

لیکن نسائی نفسیت کے مطابق فاصلے نہیں بلکہ قرب محفوظ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ آگے بڑھنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اشفاق کے لیے فاصلہ محفوظ تھا۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوتا۔ زندگی میں وہ بار بار پیچھے ہٹا۔ اُلٹے پاؤں بھاگا۔ ہونکتا ہوا اپنی نیم چھتی میں پہنچا۔ سچے دل سے باتوں کے جال بننے سے توبہ کی لیکن باتوں کے جال بننے پر وہ مجبور تھا۔ بار بار توبہ ٹوٹی۔

حتیٰ کہ گورنمنٹ کالج میں وہ محترمہ منظر خاص پر آ گئی۔

وہ محترمہ بڑی چتر کار تھی۔ اندر سے قدیم اوپر سے جدید۔ اوپر سے سادمرادی اندر بن ٹھن ہی بن ٹھن۔ اوپر سے ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ۔ اندر جذبات کی ہلچل۔ اوپر ذہن ہی ذہن اندر دل ہی دل۔ وہ محترمہ دروپدی اور گیشیا کا سنگم تھی۔ وہ محترمہ متاثر ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کی عظمت کو جانتی تھی۔ وہ محترمہ ان مشرقی خواتین میں سے تھی جو پیچھے ہٹنے والوں کو پہچانتی ہیں۔ اور خود پیچھے ہٹ کر انہیں پیچھے ہٹنے

کی ندامت سے بچالیتی ہیں۔

بڑے واقعات ہمیشہ چھوٹی سی بات سے جنم لیتے ہیں۔

ایک روز محترمہ کالج کے برآمدے سے گزر رہی تھی۔ اشفاق نے سوچا کوئی منفرد بات کروں۔اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ایک آنہ دے دیجیے۔کس لیے؟ محترمہ نے پوچھا۔سگریٹ پیوں گا۔

محترمہ نے اِکنّی ہتھیلی پر رکھ دی۔فتنہ وفساد کے ایوان کی بنیاد میں پہلی اینٹ رکھ دی گئی۔

پھر بات بڑھ گئی۔اشفاق احمد سارا دن موقع ڈھونڈتا تاکہ ہاتھ پھیلا کر کہے ایک آنہ۔محترمہ منتظر رہنے لگی۔پھر اہتمام کرنے لگی کہ جیب میں ٹوٹی ہوئی اِکنّی موجود رہے۔بات بڑھی تو محترمہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگی۔اشفاق حیران رہ گیا۔وہ "اب کیا ہوگا" کے فکر سے آزاد ہوگیا۔اس لیے آگے بڑھنے لگا اور آگے اور آگے۔یہ اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا جس میں آگے بڑھنے کی لذت تو موجود تھی لیکن فاصلہ کم ہونے کا خدشہ نہ تھا۔آگے بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے واپسی ممکن نہیں رہتی۔

اشفاق طبعاً ایک گیلی لکڑی ہے۔بھڑک کر جلنے کی صلاحیت سے محروم، صرف سلگنا جانتا ہے۔سال ہا سال سلگتا رہا۔محترمہ میں انتظار کرنے کا حوصلہ تھا۔حالات نامساعد تھے۔خاندان روایتی تھا۔باپ جابر تھا۔اشفاق گونگا تھا۔آخری قدم اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ایک بھائی اور دو دوستوں نے زبردستی اٹھا کر ملّا کے سامنے بٹھا دیا۔محترمہ کی والدہ تعلیم یافتہ تھی۔سمجھ دار تھی۔وسعت دل کی حامل تھی۔اس نے تعاون کیا۔شادی ہوگئی۔گھر والوں نے اسے بھگوڑا قرار دے دیا اور لاتعلق ہوگئے، پلّے کچھ تھا نہیں کہ گھر کا چولہا جلتا رہتا۔دونوں میاں بیوی نے کانوں پر قلم ٹانگے۔اور سکرپٹ لکھوا لو چلو جی۔کوئی سکرپٹ لکھوا لو۔کا ہوکا دیتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔یہ محترمہ بانو قدسیہ تھی۔اشفاق احمد نے برش اور رنگ کو کیوں تیاگ دیا۔اس کی جگہ قلم کو کیوں اپنا لیا۔غالباً اس لیے کہ عمل میں وہ اتنی تفصیلات نہیں دکھا سکتا تھا جو داستان گو کے بورے میں بھری ہوئی تھیں۔اصولی طور پر تو اسے مغنّی ہونا چاہیے تھا چونکہ وہ ایک عظیم کان کا مالک ہے۔لیکن اشفاق کو انسانی کردار سے دلچسپی تھی۔خالی آواز کا زیر و بم اسے جذب نہ کر سکا۔اس لیے اشفاق احمد افسانہ نویس بن گیا۔

ادب میں شہرت پانے کے بعد دنیائے ادب میں رکنا اس کے لیے مشکل ہوگیا۔اس کے اندر کی طوائف کا دم گھٹنے لگا۔اور وہ شوبزنس میں جا شامل ہوا۔اولین دور میں اشفاق احمد کو کچھ کرنے کا شوق تھا۔اب اسے کچھ کر دکھانے کا شوق ہے۔

اشفاق احمد ایک پرفیکشنسٹ ہے۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے، اس کے اندر دھنس جاتا ہے۔ اس قدر اندر دھنس جاتا ہے کہ لت پت ہوئے بغیر باہر نہیں نکلتا۔ مثلاً جب وہ ماڈل ٹاؤن میں مکان بنارہا تھا تو کوئی ایک ماہ کے لیے معمار بن گیا۔ چنائی اور پلستر کے کاموں کے اندر دھنس گیا۔ جب وہ مکان میں نلکے لگوارہا تھا تو آٹھ روز برانڈرتھ روڈ کے چکر لگاتا رہا۔ اس نے تمام ٹونٹیاں دیکھیں۔ کس کس کا منہ کھلا ہے کس کس کا بند بند سا ہے۔ بیچ میں کتنے کتنے چکر ہیں۔ کس کس کا واشل مضبوط ہے۔ کھولیں تو کتنی دھار نکلتی ہے۔ بند کریں تو چونے کی صلاحیت کس قدر ہے۔ آٹھ دن کی تحقیق کے بعد وہ ٹونٹیوں پر تفصیلی مقالہ لکھ سکتا تھا۔ کہ پاکستانی کارخانوں کی بنی ہوئی ٹونٹیوں کے کیا کیا خواص ہیں۔ کیا کیا خوبیاں ہیں کیا کیا خامیاں ہیں۔ یہ تفصیلات اکٹھی کرنے کے بعد اس نے مکان کے نلکوں کے لیے ٹونٹیاں خریدیں۔

کباب بنانے کا شوق پیدا ہوا تو لاہور کے معروف کبابیوں سے کوائف اکٹھے کرتا رہا۔ قیمہ کیسا ہونا چاہیے۔ مصالحہ کیسا ہونا چاہیے۔ آنچ کیسی، کتنی ہو۔ اس کے بعد اس نے کباب بنانے کی سیخیں خرید لیں۔ اور میاں بیوی مل کر کباب سازی کی مشق کرتے رہے۔ اب اشفاق کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اکثر دوستوں کو مدعو کرتا ہے۔ خود کباب بنائے جاتا ہے۔ دوست کھائے جاتے ہیں۔

اس شوق تحقیق کو اشفاق کام میں نہیں لا سکتا۔ اس کی تحقیق کا مقصد صرف لذت تحقیق ہے۔ ورنہ آج گلبرگ میں اس کی دکان ہوتی اور سارے لاہور میں اشفاق کبابیے کی دھوم ہوتی۔

اشفاق احمد نے آج تک اپنے صرف ایک فن سے مالی فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور وہ ہے سکرپٹ رائٹنگ۔ عرصہ دراز تک اشفاق کے گھر میں حساب کتاب سکرپٹوں میں ہوتا رہا۔ کرایہ مکان چار سکرپٹ۔ باورچی خانے کا خرچ آٹھ سکرپٹ، علاج معالجہ ڈیڑھ سکرپٹ۔ لین دین دو سکرپٹ آج بھی بانو سے پوچھو یہ صوفہ کتنے میں خریدا تھا تو وہ کہے گی اچھی طرح یاد نہیں شاید تین سکرپٹ لگے تھے۔

حیرت کی بات ہے کہ دونوں کے سکرپٹوں سے مشقت کے پسینے کی بو نہیں آتی۔ ان کے گھر چلے جاؤ تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ منشیوں کا گھر ہے۔ الٹا وہ تو فارغ البال میزبانوں کا گھر لگتا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں ان دنوں بھی ان کا گھر فارغ البالیوں کا گھر لگتا تھا جب چولہا جلائے رکھنے کا مسئلہ پیش پیش تھا۔

اشفاق کی خوش قسمتی کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔ اشفاق احمد نے ایک خاتون سے عشق کیا۔ کئی ایک سال وہ اس کے عشق میں گھلتا رہا۔ عشق میں کامیاب ہوا۔ خاتون بیوی بن کر گھر آئی تو وہ محبوبہ نہ تھی بلکہ عاشق نکلی۔ ورنہ اشفاق احمد کے جملہ کس بل نکل جاتے۔ محبوب طبیعت وہ ازلی طور پر تھا۔ بیوی کی آمد کے

بعد بالکل ہی دیوتا بن گیا۔ کانٹا اشفاق کو چبھتا ہے تو درد بانو کو ہوتا ہے، ہتھ چکی اشفاق چلاتا ہے تو آبلے بانو کے ہاتھوں میں پڑتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک خالص پکی دانشور نے پتی بھگتی میں اپنا سب کچھ جذبات ذہن روح تیاگ رکھا ہے۔ بانو بہت بڑی مفکر ہے وہ ہر بات میں صاحب رائے ہے۔ عقل وخرد سے بھرپور لیکن جب اشفاق طلوع ہو جائے تو سب کچھ سپاٹ ہو جاتا ہے۔ عقل، خرد، دانشوری۔

اشفاق کو شریفانہ قسم کا غصہ نہیں آتا غصہ تو آتا ہے لیکن غصے میں وہ بھڑک کر جلنے کی عشرت سے محروم ہے۔ وہ چڑ چڑ کرتا ہے۔ سلگتا ہے، بل کھاتا ہے اور اپنی سلگن کا دوسرے کی ناک میں دھواں دیتا رہتا ہے۔ کئی بار اس کی چڑ چڑ اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ گھر بھٹیاری کی کڑاہی بن کر رہ جاتا ہے۔ چڑ چڑ دانے بھنتے رہتے ہیں۔

یہ چڑ چڑ بھی اس کے لیے خوش قسمتی کا باعث بن گئی۔

گمان غالب ہے کہ ایک دن جب بھٹارن دانے بھون رہی تھی۔ اسے وہ شخصیت یاد آ گئی جس نے اسے چڑ چڑ کا تحفہ بخشا تھا۔ وہ گلیور جس نے بچپن میں اسے ٹھگنا بنائے رکھا تھا۔ اس وقت اشفاق احمد اپنے نئے سکرپٹ کے لیے موضوع سوچ رہا تھا۔ اس نے بچپن کے گلیور کا قصہ لکھ دیا۔

یوں تلقین شاہ وجود میں آ گیا۔

تلقین شاہ ایک جاذب توجہ کردار ہے۔ لوگوں نے تلقین شاہ سنا تو بھونچکے رہ گئے۔ ہر کسی کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے بالشیتے نے سر نکالا۔ اور دوسروں کو تلقین کرنے والے گلیور پر تالیاں بجانے لگا۔ ہم سب میں کہیں نہ کہیں ایک چھپا ہوا بالشتیا موجود ہے۔ جس کا وجود کسی نہ کسی تلقین شاہ کا مرہون منت ہے۔

تلقین شاہ کی آمد پر بہت سے بھرے ہوئے پھوڑے پھوٹ بہے، دلوں میں تنے ہوئے پیچ وتاب ڈھیلے پڑ گئے۔ دبے ہوئے غصے تمسخر کی شکل میں متبسم ہو گئے۔ انتقام کے جذبات ترس میں بدل گئے۔ پند و نصیحت کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا۔ تلقین شاہ دلچسپ کردار ہی نہیں وہ بہت اچھا "سائی کی ایڈسٹ" بھی ہے۔ ایک ذہنی ڈاکٹر جس نے بہت سے کبڑوں کو سیدھا کر دیا۔ بالشتیوں کو قد وقامت عطا کیا۔ گونگوں کو زبان بخشی، دل میں پڑی ہوئی گرہوں کو کھولا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بتوں کو توڑ دیا۔ لوگوں نے فرط محبت سے اس بُت شکن کو آنکھوں پر بٹھا لیا۔ اشفاق احمد ہکا بکا رہ گیا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ شہرت کسے کہتے ہیں۔ کہ عوام آنکھوں پر بٹھا لیں تو آسمان کے تارے قدموں میں آ گرتے ہیں۔ مگر شہرت گھر والوں کو راس نہ آئی۔ اشفاق احمد گھر میں بالکل ہی پتھر کا بت بن کر بیٹھ گیا۔ کامیابی بڑی ظالم چیز ہے۔ وہ

انسان کو پتھر کا بنا دیتی ہے۔

اس کامیابی پر بھی اشفاق احمد کو شکایت ہے۔ کہتا ہے۔ یارو کیسی اندھیر نگری ہے۔ تلقین شاہ کو تخلیق کرنے والے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ تلقین شاہ پر جان چھڑکتے ہیں۔ لکھنے والے اشفاق احمد کو نہیں مانتے اس صداکار کے دیوانے ہیں جو یہ کردار بولتا ہے۔ شکر ہے تلقین شاہ کا پارٹ ادا کرنے والا خود اشفاق احمد ہے ورنہ کوئی اور ہوتا تو اشفاق احمد تلقین شاہ کا گلا گھونٹ دیتا اور یا خودکشی کر لیتا۔

اپنی تخلیق میں اشفاق احمد کسی دوسرے فرد کو کریڈٹ میں حصہ دار بنانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ تمام تر کریڈٹ لکھنے والے کا حق ہے۔ آپ اسے کہیں کہ یار تیرے ٹی وی ڈرامے میں فلاں شخص نے اچھا رول کیا۔ یہ بات اسے ناگوار گزرے گی۔ فوراً جواب میں کہے گا۔ ہاں اس نے خاصا کام کیا۔ بڑی ڈھونڈ کے بعد یہ لڑکا تلاش کیا تھا۔ ریہرسل میں آیا تو بالکل کچا نکلا۔ بڑی محنت کرنی پڑی۔۔۔ خیر نبھا گیا۔ کریڈٹ دینے میں اشفاق احمد کٹر بنیا ہے۔

اشفاق احمد ایک باغ و بہار ساتھی ہے۔ خوش گفتار دوست ہے۔ بظاہر نرم مگر بڑا سخت گیر افسر ہے۔ چڑچڑ کرنے والا خاوند ہے۔ جو اپنی سلگن سے گھر والوں کی ناک مین دھواں دیتا رہتا ہے۔ بڑا چالاک جی حضوریہ ماتحت ہے۔ کام اپنی مرضی کے مطابق کرتا ہے۔ افسر کو یہ احساس دیتا ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ پسینہ بہانے والا کامی ہے۔ منہ زبانی مرد ہے۔ عظیم پراپیگنڈسٹ ہے۔ اثر ڈالنے کا بادشاہ ہے۔ خود پسند ہے۔ سیلف سفیشنٹ ہے۔

اشفاق احمد نے بانو کی تخلیقی قوتوں کو سچے دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ ادبی میدان میں بانو کی حیثیت اشفاق سے بلند تر ہے۔ اگر آپ بانو کی تخلیق کاری کے متعلق بات کریں تو کہے گا ہاں اچھا لکھتی ہے۔ لیکن یار بڑی مغز ماری کے بعد اسے یہاں لایا ہوں۔ اب بھی میرے فقرے چراتی رہتی ہے۔

اشفاق احمد کی خود پسندی کی زیادہ تر ذمہ داری بانو پر عائد ہوتی ہے۔ بانو اشفاق سے بے حد محبت کرتی ہے اور اس کی محبت کا شیرا اتنا گاڑھا ہے کہ وہ چپ چپ کرتی رہتی ہے۔ اشفاق اس شیرے کی دلدل میں یوں بیٹھ رہتا ہے جیسے بھینس راب کے جوہڑ میں پھنسی ہو۔

اشفاق کو اپنے رنگ میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھئے جب وہ کچھا بنیان پہنے درخت کی چھاؤں میں کھاٹ پر بیٹھا کچھ کھا پی رہا ہو۔ اشفاق کھانے کا رسیا ہے بشرطیکہ کھا جا من بھاتا ہو وہ پسند کی چیز کھاتا ہے۔ اور پھر بسیار خوری کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب وہ کھا رہا ہو تو اندر کی طوائف بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ کوئی

دیکھتا ہے تو پڑا دیکھے۔ وہ اس انہماک سے کھاتا ہے کہ گردو پیش معدوم ہو جاتے ہیں۔ لذت میں لتھڑ جاتا ہے۔ یوں جیسے مینڈک کیچڑ میں لت پت ہو رہا ہو۔ اس وقت بانو بھی قابل دید ہوتی ہے۔ وہ خوشی سے لت پت ہو رہی ہوتی ہے۔ ایک طرف ڈالڈا ہی ڈالڈا دوسری طرف ممتا ہی ممتا۔

اشفاق احمد ذات کا مستری ہے۔ اسے مشینوں سے محبت ہے۔ اور گیجٹ اس کی جان ہیں میرے سکوٹر کو دیکھ کر وہ ہمیشہ احتجاجاً بڑ بڑ کرتا رہتا ہے۔ ظالمو تم اس ننھی سی جان کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ایک چھوٹا سا نازک سا پسٹن اپنی ننھی سی جان کے بل بوتے پر لوہے کے اتنے بڑے کھڑ کھڑے کو دھکیل کر چلاتا رہتا ہے۔ ظالمو اس ننھی سی جان کا کچھ تو خیال کیا کرو۔ اس کے گھر میں مشینوں، گجٹوں اور اوزاروں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ چاہے اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو۔ دکان میں نئے گیجٹ کو دیکھ کر بچے کی طرح مچل جائے گا۔ اسے غور سے دیکھے گا۔ اس کی ورکنگ کو سمجھے گا۔ اس سے کھیلتا رہے گا۔ پھر اس کو خریدنے کے لیے تڑپتا رہے گا۔ جب تک خرید نہ لے گا چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اشفاق نے اپنے گیراج میں ایک ورک شاپ بنا رکھی ہے۔ جو تمام اوزاروں اور سامان سے لیس ہے نتیجہ یہ ہے کہ اس کے تینوں بیٹے اعلیٰ قسم کے مستری ہیں۔ لکڑی اور لوہے دونوں کاموں میں دسترس رکھتے ہیں۔

فارغ وقت میں اشفاق اپنی مشینوں اور گجٹوں کو باہر نکالتا ہے پیار سے صاف کرتا ہے۔ تیل دیتا ہے، گریس لگاتا ہے۔ کل پرزے چیک کرتا ہے۔ کوئی نقص ہو تو اسے دور کرتا ہے۔ آپ اشفاق سے اس کی موٹر مانگیں۔ کبھی نہ دے گا۔ خود کو ڈرائیور بنا کر پیش کر دے گا۔

آج بھی اتنی شہرت کا مالک ہونے کے باوجود اتنی جان پہچان ہونے کے باوجود، میل ملاپ کے باوجود اشفاق احمد اندر سے وہی رابنسن کروزو ہے۔ جو کئی ایک برس پہلے خان منزل کی نیم چھتی میں مقیم تھا۔ بنیادی طور پر وہ آج بھی لوگوں سے ملنے سے ہچکچاتا ہے۔

اکیلے میں وہ یوں بیٹھا ہوتا ہے جیسے مگرمچھ ساحل کے کنارے دھوپ میں کیچڑ میں لت پت پڑا ہوتا ہے۔ اس وقت اگر کوئی اطلاع دے کہ فلاں صاحب ملنے آئے ہیں تو اس کے ماتھے پر تیوری اُبھرتی ہے۔ تلوار سی دھار والی تیوری۔ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے اس کے چہرے پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے۔ مارے گئے۔

یہ اور بات ہے کہ ملاقاتی کمرے میں پہنچ کر اس کے اندر کی طوائف جاگ اٹھے اور وہ باتوں کے سنہرے جال بننا شروع کر دے۔ شاید آپ میری بات نہیں مانیں گے اگر میں کہوں کہ لاہور میں اتنے

سال رہنے کے باوجود وہ کوئی دوست نہیں بنا سکا۔ کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جس کا اشفاق انتظار کھینچے۔ جسے کوئی بات بتانے کے لیے بے قرار ہو۔ اس میں دوست بنانے کی صلاحیت سرے سے مفقود ہے۔۔۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سیلف سفیشنٹ آدمی ہے۔ اشفاق احمد اینٹی سوشل نہیں صرف ان سوشل ہے۔ اس نے کئی بار شدت سے محسوس کیا ہے کہ اسے سوشل بننا چاہیے۔ کئی بار میاں بیوی نے بیٹھ کر سوشل بننے کا پروگرام بنایا کہ شام کو سوشل وزٹ کیا کریں گے آج ان کے ہاں کل اُن کے ہاں۔ انہوں نے قابل وزٹ لوگوں کی ایک لسٹ بنائی درجہ وار لسٹ۔ بازار سے ایک جامع کتاب خریدی جس میں سوشل گفتگو کی تفصیلات درج تھیں۔ سوشل آداب درج تھے۔ ایک مہینے کی تیاری کے بعد جب عمل کا موقعہ آیا تو ایک ہفتہ وزٹ کرتے رہے۔ آٹھویں دن دونوں بیٹھے آہیں بھر رہے تھے۔ مشکل کام ہے۔ اشفاق نے کہا۔ نہیں بنی بات۔ بانو نے جواب دیا۔ الٹا بگڑ رہی ہے۔ اشفاق نے کہا اور سوشل پروگرام ختم ہو گیا۔ اشفاق احمد کے گھر کا مرکز ڈرائنگ روم نہیں بلکہ باورچی خانہ ہے۔ باورچی خانے کے ایک جانب میز لگا ہوا ہے۔ یہ باورچی خانہ ہی ڈرائنگ روم ہے۔ یہی ڈائننگ روم ہے، یہی سٹنگ روم ہے۔

اشفاق کے گھر کا باورچی خانہ سارا دن اور آدھی رات تک یوں چلتا رہتا ہے جیسے رہٹ والا کنواں۔ اس رہٹ پر بانو بندھی رہتی ہے۔ یہ بانو کا کمال ہے کہ بندھی ہونے کے باوجود بندھی نہیں دکھتی۔ وہ باورچی خانے میں یوں ایستادہ نظر آتی ہے جیسے جھیل میں کنول کا پھول اُگا ہو۔ دونوں ہی مہمان داری کے جذبے سے یوں بھرے ہوئے ہیں جیسے گلا ہوا مالٹا رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اشفاق پٹھان ہے۔ بانو جاٹ ہے۔ دونوں ہی کھلانے کے متوالے ہیں، سونے پر سہاگا نور بابا نے چھڑکا۔

نور بابا صوفی منشی درویش تھا۔ اس کا ڈیرا لاہور چھاؤنی کی ایک سڑک پر واقعہ تھا۔ نور بابا کا مسلک لوگوں کو کھانا کھلانا تھا۔ پتہ نہیں اشفاق ڈیرے پر کیسے جا پہنچا۔ بابا کو اشفاق کی باتیں بہت پسند آئیں۔ بابا اشفاق سے محبت کرنے لگا۔ لہٰذا اشفاق کا ڈیرے پر جانا لازم ہو گیا۔

نور بابا کہتا تھا۔ پتر لوگوں کو کھلاؤ۔ جو کچھ تم خود کھاتے ہو پہلے اسے حلال کر لو۔ خود کھانے سے پہلے دوسروں کو کھلاؤ۔ دوسروں کو کھلاؤ گے تو وہ حلال ہو جائے گا۔ سودا خریدو تو اسے پہلے حلال کر لو۔ دوجے کے لیے آٹا خریدو چاول خریدو۔ خود کپڑا پہننا ہے تو پہلے دوسرے کے لیے کپڑا خریدو۔

اشفاق کو بات دل لگی۔ اس نے بانو کو بتائی دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ کھلاؤ۔ کھلاؤ۔ کھلاؤ۔ یوں ان کا باورچی خانہ چلنے لگا یوں چلنے لگا جیسے رہٹ چلتا ہے۔ یہ رہٹ آج بھی چل رہا ہے۔ بانو اس رہٹ سے

بندھی ہے۔ اسے چلا چلا کر اس کی نسیں تار تار ہو چکی ہیں۔ پٹھے سخت ہو چکے ہیں۔ جسم میں جان نہیں رہی۔ لیکن رہٹ چل رہا ہے۔

اشفاق احمد کے گھر سے مجھے محبت ہے۔ میرے لیے وہ یوں ہے جیسے طوفان زدہ پانیوں میں سرسبز جزیرہ ہو۔ وہ میرے لیے پناہ گاہ ہے، عشرت کدہ ہے۔ وہ پاکیزہ جگہ جہاں ذکر حبیب رہتا ہے۔

مجھے اس گونگے اکیلے رابنسن کروزو سے شدید لگاؤ ہے۔ جو فرش پر اپنی انا میں لت پت پڑا رہتا ہے۔

مجھے اس فرائی ڈے سے بے پناہ محبت ہے جو ممتا کے گاڑھے شیرے کی کڑاہی لبالب بھرے خدمت کے جذبے سے سرشار پتی بھگتی کا دیا جلائے بیٹھی ہے۔

مجھے ان تین جنوں سے پیار ہے۔ جو دو بڑے تخلیق کاروں کے سائے تلے رہ کر بھی کبڑے نہیں ہوئے۔

☆☆☆

○ پی ٹی وی سے نشر ہونے والے پروگرام ''زاویہ''
میں سے اشفاق احمد کے چند منتخب پروگرام
○ اللہ والے لوگ ○ نیک خواہشات ○ خدا کس کی سنتا ہے
○ احساس ○ بلوچوں کا ڈیرہ

اللہ والے لوگ

اس محفل میں یہ بات طے نہیں ہوتی یا میں سوچ کے نہیں آتا کہ آج کیا بات کریں گے، بیچ میں گفتگو کے دوران ہی کچھ نہ کچھ نکل آتا ہے اور وہ آپ تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن آج پہلی مرتبہ مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ آپ اپنے بابا کے بارے میں بات ضرور کریں۔ پہلے پہلے ابتداء میں تو کی، پھر اس کے بعد کچھ اور موضوعات رہے، پھر کہیں ان موضوعات سے پھسل کر آگے نکل گئے تو آج یہ فرمائش جو ہے مجھے بھی دل سے پسند آئی ہے۔

اور آپ سب نوجوان ہیں، اور یہ بات میں کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ بابے کون ہوتے ہیں۔ یہ کیوں ہماری زندگیوں میں آ گئے، اور ان کے ساتھ کیا تعلق ہوتا ہے اور ملتان میں بابے زیادہ کیوں ہوتے ہیں، اور شہروں میں کم کیوں ہوتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو چونکہ یہ فرمائش کی گئی ہے۔ تو میں یہ عرض کروں کہ ہمارا ایک ڈیرہ تھا، جہاں میں یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر چکنے کے بعد ولایت میں رہنے کے بعد ولایت کی یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد جب لوٹ کے یہاں آیا تو 1954ء میں، میں اس ڈیرے پر گیا۔ اُس ڈیرے والے کا نام تھا حضرت سائیں فضل شاہ صاحب۔ نور والوں کا ڈیرہ اسے کہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی دیواریں

تھیں اس کی، اور اندر کچھ بھیڑ بکریاں، اور ایک بھینس بھی ہوتی تھی۔ صفائی کا انتظام ایسا اچھا نہیں تھا، کیونکہ جب آدمی صفائی کی طرف توجہ دینے لگتا ہے تو باہر کی صفائی کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اندر کی صفائی کی طرف کم ہو جاتی ہے۔ خیر یہ میرے لیے ساری نئی باتیں تھیں۔ آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس نوعیت کا، اور کسی قسم کا ہوگا۔ ہمارے بابا جی بے چارے تعلیم یافتہ نہیں تھے لکھنا پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا، لیکن انہوں نے کہیں سے انگریزی کا لفظ نوٹ Note سیکھا ہوا تھا۔ جب کوئی بات بہت خیال انگیز ہوتی تھی، نہایت Thought provoking، تو وہ انگلی اٹھا کے کہتے تھے نوٹ۔ تو ہم سب چونک کر متوجہ ہو جاتے تھے کہ کوئی بات نہایت اہم ہوگی، اور ہم اسے سنبھال کر رکھیں اور یہ آئندہ زندگی میں کام آئے گی۔ اسی طرح ان کے اردگرد جو لوگ تھے، ان کو بھی انہوں نے خطاب دے رکھے تھے ماڈرن قسم کے، مثلاً وہاں پر ایک ڈاکٹر صاحب تھے اشرف فاضلی صاحب تو دوسرے جوان کی خط و کتابت کا کام کرتے تھے وہاں ڈاک آتی تھی، جو اس کا جواب دیتے تھے ان کو وہ سیکرٹری صاحب کہتے تھے۔ جو حساب و کتاب پیسے ویسے لوگ دے جاتے تھے کھانے والے کے تو ان کو وہ فنانس سیکرٹری کہتے تھے۔ تو یہ لوگ بھی بڑے خوش ہوتے تھے کہ بیٹھے بٹھائے اتنے بڑے رتبے مل گئے ایک روز ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ یہاں بہت اچھی باتیں ہوتی ہیں اور بہت توجہ طلب باتیں ہوتی ہیں کیوں نہ یہاں سے ایک رسالہ نکالا جائے، اور وہ چھاپا جائے اور چھاپ کے لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ بڑی اچھی بات تھی، ایسے ہی ہوتا ہے۔ تو ہم نے بیٹھ کے رسالے کی پوری ایک ڈمی تیار کی اس کا فارمیٹ سوچا، ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب اس کے ایڈیٹر قرار دیئے۔ سیکرٹری صاحب ظاہر ہے منتظم اعلیٰ وہی تھے میں نے کہا اچھا میں بھی کچھ لکھوں گا، سارا کچھ تیار کیا تو ہم یہ ساری سکیم بنا کے ان کی خدمت میں لے گئے۔ ہم نے کہا جی کہ ہم ایک رسالہ نکالنا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا پہلے بھی ایک رسالہ نکلا یہاں سے تھوڑی دیر کے لیے پھر بند ہو گیا۔ تو کہنے لگے، آپ رسالہ کیوں نکالنا چاہتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا، اس لیے کہ ہم آپس میں اتحاد اور Unity پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، اور ملیں گے، ان کو یہ Message جو ہے، یہ دور دور تک پہنچتا رہے گا اور استفادہ ہوگا ہماری بڑی آرزو ہے کہ مسلمان ایک ہوں، ان میں Unity ہو ان میں اتحاد ہو، ان میں یکجہتی ہو۔ تو آپ نے کہا: "Note" جماعت عملاً ایک دوسرے کے کام آنے سے بنتی ہے صرف قوم کے اندر رہنے سے فرض اور حق پورا نہیں ہوتا کیونکہ اس ساری چیز کا تعلق قوم سے ہے اور عمل اس سے مختلف چیز ہے، اگر آپ جماعت بنانا چاہتے ہیں، اور آپ بھی اکثر کرتے ہیں، اور گھر میں بات بھی ہوتی ہے تو قول سے گفتگو سے

کبھی نہیں ہوگی۔

دیکھیئے ہمارا اللہ ایک ہے ہمارا رسول ایک ہے، ہمارا نماز پڑھنے کا طریقہ ایک ہے، ہمارا قیامت کے اوپر ایمان ایک سا ہے، لیکن اس کے باوصف یک جہتی نہیں ہوتی۔ کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوچنے کی بات تھی تو ایسی باتیں بابوں کے ہاں سے ملتی ہیں کہ جب تک ایک دوسرے کا دُکھ درد نہیں سنو گے ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانو گے، کون کس کیفیت سے گزر رہا ہے۔ محض گفتگو کر دینے سے کام نہیں بنے گا۔ کہتے تھے Note جماعت عملاً ایک دوسرے کا ساتھ دینے سے وجود میں آتی ہے۔ خالی قول کے ساتھ جماعت کی یکجہتی کا حق ادا نہیں ہوتا آپ عمل میں داخل ہوں گے تو پھر یہ حق ادا ہوگا تو پھر یہ کام ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔ ہم اب بھی یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم یہ ایک کتاب، رسالہ، اخبار نکالتے ہیں اگر ہم ایک لیکچر دیں اگر پروفیسر جا کے سٹیج پر کھڑا ہو کر ایک بات بتا دے اور وہ سٹوڈنٹ کے ذہن میں اُتر جائے اس سے ان کے اندر یکجہتی پیدا ہو جائے ایسا ہوتا نہیں۔ کبھی بھی نہیں ہوا۔ دنیا کے کسی خطے میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قول کی اہمیت نہیں ہے۔ کہی جانی والی بات کی اہمیت نہیں ہے یقیناً ہے۔ لیکن بابا جی فرماتے ہیں کہ Note قول ایک سواری ہے جو آپ کو عمل کے کنارے پر لے جاتی ہے۔ خرابی یہ ہوتی ہے کہ ہم قول کی سواری کو اختیار کرتے ہیں اس کشتی میں بیٹھتے ہیں چپو چلاتے ہیں عمل کے کنارے پر پہنچتے ہیں لیکن اس کشتی کو چھوڑتے نہیں ہیں۔ اس کے اندر رہتے ہیں وہ وہیں چکر کاٹتی رہتی ہے عمل کا کنارا سامنے رہتا ہے اور ہم اس کی طرف جا نہیں رہے ہوتے اور ہم کوشش یہ کرتے ہیں پڑھے لکھے لوگ نوجوان میرے ساتھ ہیں ہم کوششیں صرف یہ کرتے ہیں کہ کمیونیکیشن سے صرف ڈائیلاگ سے صرف گفتگو سے بات بن جائے گی، کبھی نہیں بن سکتی۔ کیونکہ انسان کا وجود اس کی سائیکی اس کا ہونا اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ کوئی بندہ میری بات سنے اور میرے دُکھ درد میں شریک ہو۔ یہ جو آپ نے اکثر دیکھا ہوگا آج کل خودکشیاں ہو رہی ہیں لوگ خودسوزیاں کر رہے ہیں عام طور پر ایک اچھا جرنلسٹ یہی کہتا ہے کہ چونکہ ملازمتیں نہیں مل رہیں بھوک ننگ بہت ہے اس وجہ سے یہ سارا کام ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بات نہیں ہے اس وقت آپ کے پاکستان کا نوجوان خاص طور پر ایک آدمی اس کندھے کی تلاش میں ہے جس پر وہ اپنا سر رکھ کر اپنا دُکھ بیان کر سکے اور کوئی کندھا دینے کے لیے تیار نہیں کسی کے پاس وقت ہی نہیں۔ اگلے زمانے میں ہمارے زمانے میں ہمارے باپ دادا کے زمانے میں، دُکھ سکھ کرنے کے لیے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ان کے پاس اکنامکس کے اتنے مسائل اور اتنی پرابلمز نہیں تھیں۔ ولایت والوں نے یہ طریقہ نکالا کہ وہ دُکھ سننے کے

آئیں گے ماہر نفسیات کے۔ جو یہ کہتے ہیں اگر آپ نے اپنا دُکھ بیان کرنا ہے تو دو سو روپیہ گھنٹہ مجھے دیں ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں۔ اگر آپ لاہور کی نہر کے کنارے کنارے جائیں تو دو تین بورڈ آپ کو نظر گھنٹہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں پرسوں پھر آ جانا تم اپنے دُکھ بیان کرو مجھے پیسے دے دو۔ ہمارے ہاں بھی اب لیے فیس لیتے ہیں۔ یہ سائیکاٹرسٹ جو ہوتے ہیں سائیکوتھراپسٹ جو ہوتے ہیں یہ آپ سے تین سو ڈالر فی

دُکھ اپنا بیان کر کے چلے جائیں تو وہ بھی ایک تھراپی ہے، لیکن پہلے زمانے میں ہمارے ہاں مفت اور عام ہوتی تھی۔ اب لوگ اتنے مصروف ہو گئے کہ کسی وجہ سے پھنس گئے تو جب تک عمل کے اندر آدمی داخل نہیں ہو گا دوسرے آدمی کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ میرا کچھ لگتا ہے میرا کچھ بھائی بند ہے۔ اگر آپ اس کے سامنے تقریر کر کے چلے جائیں گے تو اس کی انفارمیشن میں اضافہ ہو جائے گا اور خطرہ یہ ہے کہ وہ یہ ساری انفارمیشن سمیٹ کے ایک اگلے آدمی سے وہ بات کرنے لگ جائے گا۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کبھی آپ نے ہمارے ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھے ہیں، دینی باتیں سوالوں کے جواب بڑی تیزی سے دیئے جاتے ہیں۔ وہ انفارمیشن ہوتی ہے اس کا ذات کے ساتھ اپنے وجود کے ساتھ یا اپنی سائیکی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تو آپ نے ہمیں منع کیا کہ دیکھیے ایسے نہ کریں رسالہ نہ چلائیں چھوڑیں اس کام کو، کسی کے کام آسکتے ہیں تو وہ چھوٹا سا کام کریں۔ میں نے کہا جی کام، اب میں اتنا پڑھا لکھا آدمی جب میں بہت نوجوان تھا اور سوٹ پہنتا تھا تھری پیس اور سونے کی پن لگاتا تھا ٹائی میں۔ میں نے کہا میں کسی کے کیا کام آسکتا ہوں میں تو ایک معزز آدمی ہوں پروفیسر ہوں۔ کہنے لگے نہیں یقیناً آپ کام آسکتے ہیں۔ کہنے لگے یہاں اماں جی رہتی ہیں۔ وہاں صابن کی کچھ دکانیں تھیں وہاں پر ایک مائی تھی دائی کا وہ کام کرتی تھی۔ تو اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ تو کہنے لگے اس کی بیٹی کی شادی ہے اور اس کا جو منگیتر ہے اماں نے لڑکا چنا ہے۔ وہ سگنلر ہے بابا جی نے پتا نہیں لفظ کہاں سے سیکھا، سگنلر وہ ہوتا ہے جو موری کے اوپر تار باندھے کہنے لگے وہ سگنلر ہے محکمہ ڈاک بنگلہ میں۔ ڈاک بنگلہ نہر کا بنگلہ۔ انگریز کے زمانے میں یہاں ریل تار ڈاک کا انتظام بہت غضب کا تھا۔ جب یہ نہریں کھودیں انہوں نے ان کے کنارے بڑے اعلیٰ درجے کے بنگلے بنوائے ہچ ٹریز والے بنگلے ان میں فلمیں بھی بڑی شوٹ ہوتی تھیں اعلیٰ درجے کی اس کے اندر بلڈنگیں ہوتیں تھیں، وہاں پر ایک آفس بھی ہوتا تھا جہاں پر سگنلر کنڈکٹر تھا خدانخواستہ اگر نہر میں کوئی خرابی ہو پانی روکنا ہو یا کوئی اور کھٹا کھٹ ہو۔ تو وہ سگنلر کو بہت بڑی چیز سمجھتے تھے۔ 60 روپے تنخواہ والا سگنلر۔ وہ لڑکا بھی پسند کر لیا تھا۔ تو مجھے کہنے لگے تمہارے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی ہے وہ سیگنیلر کا ابا جو ہے وہ آ رہا ہے تحقیق و تفتیش کرنے

کے لیے لڑکی کتنا کام کرتی ہے چارپائیوں کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھتی ہے کہ نہیں شام کو بستر ے بچھاتی ہے کہ نہیں گھڑا پانی کا بھر کے لاتی ہے کہ نہیں تو وہ وہاں رہے گا کچھ دن وہ جو روٹی کھاتا ہے وہ گندم اور مکئی کا آٹا ملا کے کھاتا ہے اب نخرہ دیکھیں اس کا۔ تو تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ تم دس سیر پکا مکئی کا آٹا اپنی موٹر میں رکھ کراماں جی کے پاس پہنچاؤ۔ میں نے کہا مجھے کوئی اچھا سا کام دیں لکھنے کا یہ کیا ہے۔ مجھے کہنے لگے، وہ اس لیے دینا ہے کہ ہم نے اس بابے کی عزت افزائی کرنی ہے اور ہماری بیٹی کی شادی ہے۔ تو میں نے کہا اچھا جی تو میں گیا بھی اس سے ملا بھی بابے سے انہوں نے کہا، خبر دار اس کی بہت عزت کرنی ہے، اور اس کو سلام کرنا ہے۔ میں نے کہا جی میں دو مرتبہ کرنے کو تیار ہوں۔ جب میں لوٹ کے آیا اگلے دن۔ تو کہنے لگے وہ حقہ پیتا ہے تو میں نے کیکر کی چھال جو ہے نا جس کو کیکر کے سکڑ ے کہتے ہیں تو اس کا کوئلہ بہت اچھا ہوتا ہے اور جو پرانے بابے حقہ تمبا کو پینے والے ہیں۔ اس کی آگ دھرتے ہیں تو یہ سکڑ ے جو ہیں یہ تھے سیر ڈیڑھ انہیں دے دو۔ میں نے کہا، جی دفع کریں چبا سا آدمی ہے۔ وہ کہنے لگے نہیں نہیں، یہ نہیں کہنا۔ وہ اللہ کی مخلوق ہے، اور وہ انبیاء کا بیٹا ہے۔ میں نے کہا وہ بندہ۔ کہنے لگے، ہاں حضرت آدم کی اولاد جو ہے۔ اچھا وہ ہر ایک کو کہتے تھے کہ نبی کا بیٹا ہے تو ہماری برکت ہو گی لو جی یہ نبی کی دھی ہمارے ڈیرے پر آ گئی ہے۔ خیر ہمارے لیے یہ بات سیکھنی بہت مشکل تھی، تو جب انہوں نے یہ ڈیوٹی لگائی ہم بہت روئے پیٹے کہ رسالہ چلنے سے رہ گیا۔

امریکہ سے کوئی صاحب آئے انہوں نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ اشفاق صاحب! میں پتا نہیں کتنے ملین ڈالر اکیس برس امریکہ رہنے کے بعد کما کر لایا ہوں، میں نے اسلام آباد میں کچھ کام شروع کیا ہے اسلام یک جہتی اور ملک وقوم کی خدمت کرنے کے لیے، تو آپ آئیں۔ تو میں نے کہا سنیں آپ جو بھی کریں گے ٹھیک ہو گا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کے کیا کروں گا۔ میں آپ کو کوئی اچھا سا بجھاؤ نہیں دے سکتا۔ کہنے لگے نہیں آپ ضرور آئیں۔ تو میں نے ٹیلی فون پر ان سے کہا دیکھئے آپ ایک بہت بڑی ساری بلڈنگ بنائیں گے، پھر اس میں آپ ایک سیکشن رکھیں گے اس میں درس قرآن شروع کریں گے پھر تجوید کا رکھیں گے پھر آپ قرآت سکھائیں گے، بس یہی چیزیں ہوں گی۔ یہ آپ کرتے رہیں، اچھی بات ہے لیکن وہ جو آپ کی آرزو ہے کہ لوگ جو ہیں وہ ایک جماعت کا رخ اختیار کریں تو وہ عملاً کرنے سے کام ہو گا اور رسالہ چھاپنے سے نہیں ہو گا۔ اب بھی جو دینی جماعتیں ہیں وہ بار بار یہی کہتی ہیں، آپ نے دیکھا ہو گا بے شمار لوگ آپ کے پاس بھی آتے ہیں، کتابیں آتی ہوں گی شاید، بڑی اچھی بات ہے۔ وہ کشتی

ضرور ہے وہ ساحل تک ضرور لے جاتی ہے لیکن ساحل پر خود اس کو اُترنا پڑے گا، اب ہمارے لیے یہ بات بڑی مشکل ہوگئی کہ یہ کیسے کریں ؟ کہ ہم اس کو چھوڑ کر عمل کی طرف آئیں ۔ انہوں نے کہا اگر Unity چاہتے ہیں آپ ، اتحاد چاہتے ہیں، تو پھر آپ کو عمل کے اندر داخل ہونا پڑے گا۔ ایسے کام نہیں بنے گا۔

ایک مرتبہ ہم لاری پر جوہر آباد جا رہے تھے، بڑی دیر کی بات ہے میرے ساتھ لاری میں ایک اور معزز آدمی پرانی وضع کے ریٹائرڈ تھے، گرمی بہت تھی انہوں نے پگڑی رکھی ہوئی تھی گود میں۔ ہوا آ رہی تھی۔ تو ایک خاص علاقہ آیا، تو انہوں نے پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی، اور ادب سے بیٹھ گئے تو میں متجسس آدمی تھا۔ میں نے کہا: ''جی یہاں کسی بزرگ کا مزار ہے'' کہنے لگے: ''نہیں'' میں نے کہا: ''جی کوئی درگاہ ہے یہاں'' کہنے لگے: ''نہیں''، تو میں نے کہا: ''معاف کیجیے گا، میں نے یہ دیکھا ہے کہ آپ نے پگڑی جو ہے وہ گود سے اٹھا کر سر پر رکھ لی ہے تو باادب ہو کے بیٹھ گئے ہیں کوئی وجہ تو ہوگی'' کہنے لگے: ''بات یہ ہے کہ میں اس علاقے کا واقف ہوں، یہاں ڈیزرٹ تھا، اور ریت تھی، اور کچھ بھی نہیں تھا۔ تو حکومت نے سوچا کہ اس میں کوئی فصل اُگائی جائے۔ تو لوگ آتے نہیں تھے ایک آدمی آیا اس نے آ کر جھونپڑا بنایا، اور جھونپڑا بنا کر یہاں پانی کی تلاش میں ٹیوب ویل وغیرہ سنک کرنے کی کوشش کی۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے یہاں سبزہ اگایا جس نے عملی صورت میں اس زمین کو ہریالی بخشی، تو میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں، پتا نہیں وہ آدمی کہاں ہو، میں نے اس کے احترام میں یہ پگڑی اُٹھا کے رکھ لی'' دیکھیے یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہماری زندگی کے اوپر عجیب طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں، اور اگر آپ اپنی آنکھیں بالکل کھلی رکھیں۔ (حاضرین کی بھنبھناہٹ) ماشاء اللہ کھلی رکھتے ہیں، کان بھی، تو آپ کو ارد گرد اتنی کہانیاں ملیں گی، جن کے اوپر آپ نے اس سے پہلے توجہ نہیں دی ہوگی۔ ہمارے استاد تھے پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب تو ہم سیانے تھے۔ میں ففتھ ایئر میں پڑھتا تھا ان کی ایک عادت تھی کہ جب کسی کی شادی ہوتی تھی نا، لڑکی کے گھر والوں میں، تو ان کے گھر جا کر بارات کو کھانا کھلانے کا بندوبست ان کے سر پر ہوتا تھا۔ تو صوفی صاحب نے ہم کو کہا کہ چلو بھئی فلاں گھر میں کھانا برتانا ہے، دینا ہے، بارات آ گئی ہے۔ مجھے یاد ہے ہم بھاٹی دروازے بتیاں والی سرکار کے پیچھے ایک گھر تھا، وہاں چلے گئے۔ انہوں نے کہا: ''لو جی صوفی صاحب آ گئے فکر کی کوئی بات نہیں'' نائی دیگیں لے آئے۔ اب جو بارات تھی اس کے بارے خیال تھا کہ 80 کے قریب بندے ہوں گے۔ وہ 160 کے قریب آ گئے۔ اب صوفی صاحب کی آنکھیں، اگر آپ میں سے کسی کو یاد ہیں

ماشاء اللہ بہت موٹی تھیں، گھبرا گئے اور ان کے ماتھے پر پسینا اور ناک پر بھی آ جاتا تھا۔ کہنے لگے: "اشفاق !ہن کیہہ کریئے" میں نے کہا: "پتا نہیں، دیگوں میں پانی ڈال دیتے ہیں" پہلا موقع تھا۔ میں 5th year کا سٹوڈنٹ تھا۔ انہوں نے ایک تھپڑ مارا میرے منہ پر۔ زور سے۔ کہنے لگے: "بیوقوف آدمی اس میں پانی ڈال کے مرنا ہے۔ وہ تو فوراً ختم ہو جائے گا۔ اس میں گھی کا پیپا ایک اور ڈالنا ہے۔ گاڑھا ہو جائے گا تو کھایا نہیں جاتا" اب ہم اندر سروے کر رہے تھے، اور صوفی صاحب بیچ میں سے نکال کے ڈالتے جاتے تھے۔ ہم باراتیوں سے کہتے اور لائیں۔ وہ کہتے تھے گرم لاؤ جی۔ ہم تو بھاگے پھرتے تھے۔ اب آخر کیفیت یہ آ گئی کہ دیگیں ختم ہو گئیں اور ان کا چہرہ دیکھنے والا تھا وہ کانپ رہے تھے۔ اگر کسی نے اندر سے کہہ دیا کہ اور قاب بھیجیں، تو ان کے پاس دینے کے لیے صرف ایک رہ گئی تھی، لیکن وہ ڈرے ہوئے تھے۔ جب خوفزدہ تھے تو اندر سے آواز آئی بس۔ جب دوسرے بندے نے کہا، بس جی صوفی صاحب۔ تو صوفی صاحب کے ہاتھ میں جو کپڑا ہوتا تھا وہ گرا، اور اتنی شدت سے پیچھے گرے کہ وہ بڑا سا کڑھاؤ تھا، شکر ہے، ان کے سر پر نہیں لگا تو ہم نے اٹھا کر ان کو بستر پر لٹایا، اور ٹانگیں پاؤں دبائے۔ جب تلی مالش کی اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ میں نے کہا: "خدا کے واسطے ایسی ٹینشن کا کام آئندہ نہیں کرنا" کہنے لگے: "نہیں بالکل نہیں میری بھی توبہ" وہاں سے ہم چل پڑے، پیچھے ہم شاگرد۔ اب آگے آگے صوفی صاحب، کوئی پندرہ بیس گز سے زیادہ گئے ہوں گے۔ ایک مائی باہر نکلی، کہنے لگی: "لو غلام مصطفیٰ میں تے تینوں لبھدی پھرنی آں، تاریخ رکھ دتی اے۔ تیرہ بھادوں دی کاکی دی" تو صوفی صاحب جو توبہ کر کے نکلے، کہنے لگے: "کاغذ ہے، ہاں پنسل ہے" کہنے لگے: "ہاں۔ لکھ تیرہ سیر گوشت اک بوری چول" صوفی صاحب لکھوا رہے ہیں۔ تو میں نے کہا: "جی یہ پھر ہو گا" کہنے لگے: "نہیں یہ تو ان کی ضرورت ہے" میں نے کہا: "آپ صرف پڑھایا کریں کتاب کی تشریح وغیرہ" تو یہ ان کا کام تھا، تو یہ جو عمل کی دنیا ہے اس میں داخل ہونا ضروری ہے۔

عالم لوگ پڑھے لکھے میرے جیسے پروفیسر بات کرنے والے، ایڈیٹوریل لکھنے والے کہتے ہیں گفتگو اگر ہوتی رہے، اگر اس طرح کا مواد چھپتا رہے تو لوگ ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے۔ جب میں بہت تنگ آ جاتا تھا، کبھی لاڈ میں ہوتا تھا۔ تو میں پوچھتا تھا ان سے کہ بابا جی یہ بتائیں کہ دین کیا ہوتا ہے اسلام کیا ہوتا ہے مومن کیا ہوتا ہے؟ تو میں نے ایک دن پوچھا ان سے۔ میں نے کہا: "جی بابا جی بتائیں کہ مسلمان کون ہوتا ہے؟" کہنے لگے: "مسلمان وہ ہوتا ہے۔ جس کا دل صاف ہو، اور ہاتھ گندے ہوں" میں نے کہا: "حضور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی" کہنے لگے: "جو بھائیوں کے کام کرتا رہے گا اس

کے ہاتھ تو گندے ہوں گے، جو آرام سے بیٹھا ہوگا دستانے پہن کے اس کا تو کچھ نہیں خراب ہونا ہے۔تو مسلمان وہ ہوتا ہے جو اُس کا گارا لگاتا ہے، اُس کی اینٹ اُٹھاتی ہے، اُس کے لیے لکڑیاں لا کر دیتی ہیں جو روتا ہے اس کے آنسو پونچھتے ہیں۔وہ ہوتا ہے مسلمان'' ہم کو تو ایسی Defination کسی کتاب میں نہیں ملتی ہے یہ اُن کے پاس بیٹھنے سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے ایسی چیزیں ملتی ہیں تو اب عمل میں داخل ہونے کے لیے کیا کچھ کیا جائے، کیسے کیا جائے، یا یہ بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ گفتگو بڑی آسان ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں، احسن صاحب، ٹیلی کمیونیکیشن کے چیف انجینئر ہیں۔وہ کہتے ہیں جتنی بھی فارن کالز ہوتی ہیں، ان میں اکثر لوگ یہی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ:''ہور سناؤ کیہ حال اے'' ہور سناؤ جی کہتا رہتا ہے آدمی۔ یا زیادہ سے زیادہ موسم کا حال پوچھتا ہے۔تو کہنے لگے اگر ان ٹرنک کال میں سے لانگ ڈسٹنس کالز میں سے''ہور سناؤ کیہ حال اے'' کو جمع کیا جائے اور جتنا ٹائم وہ بنتا ہے، اس ٹائم کے اندر ساڑھے تین میل لمبی سرنگ کھودی جا سکتی ہے۔وہ عمل میں ٹرانسلیٹ کر رہے ہیں نا اس کو۔تو اب یہ فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ نے دین کو کس حساب سے اختیار کرنا ہے۔بابے تو یہ کہتے ہیں کہ کسی کے دُکھ درد میں شریک ہوں اور اپنے ہاتھ گندے رکھو، اور دل اپنا صاف ستھرا رکھو، پھر تو مزہ ہے، پھر Unity ہوگی، کہے بغیر لکھے بغیر۔یہ مسلمانوں کو کیا ہوگیا کہ آپس میں ملتے نہیں ہیں۔یہ کیا ہوگیا۔یہ کرنے سے ہوتا ہے، اور ان کے قریب جانے سے ہوتا ہے ان کی دُکھ درد کی کہانی سننے سے ہوتا ہے۔نہ بھی کچھ کر سکیں تو ایک کان ضرور ان کے ساتھ لگا کر بیٹھیں، ان کو بڑی ضرورت ہے، سارے اس بات کے لیے تقاضا کر رہے ہیں کہ آئیں، اور ہمارے پاس بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔اللہ حافظ۔

☆☆☆

نیک خواہشات

میں اکثر عرض کرتا ہوں کہ جب وقت ملے اور گھر میں کوئی دیوار ہو تو اس کے ساتھ ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ کر اپنا تجزیہ ضرور کیا جانا چاہیے۔ یہ ہے تو ذرا سا مشکل کام اور اس پر انسان اس قدر شدت کے ساتھ عمل پیرا نہیں ہو سکتا، جو درکا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی اپنی باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ یہ جو رفوگر ہیں کشمیر میں برف باری کے دنوں میں اپنا سوئی دھاگہ لے کر چلے جاتے ہیں اور وہاں کپڑے کے اندر ہو جانے والے بڑے بڑے شگافوں کی رفوگری کا کام کرتے ہیں جن میں خاص طور پر گرم کپڑوں کے شگاف اور لگار اور چاخ جو ہوتے ہیں ان کی رفوگری کرتے ہیں کہ ہم ٹریس نہیں کر سکتے کہ یہاں پر اتنا بڑا Gapel سوراخ ہو گیا تھا، کیونکہ وہ بالکل ایسا کر دیتے ہیں جیسے کپڑا کارخانے سے بن کر آتا ہے۔

یہ رفوگروں کا کمال ہے۔ وہ غریب لوگ اپنی چادر لے کر اور اپنی کانگڑی مٹی کی بھٹی سلگا کر اس میں کوئلے ڈال کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوتے ہیں اور بہت بھلے لوگ ہیں یہ کشمیری لوگ۔ بڑی ہی بھلی کمیونٹی ہیں کیونکہ وہ اپنا تجزیہ کرتے ہیں اور ان کو پتہ چلتا رہتا ہے اپنے اس Self کا جو لے کر انسان پیدا ہوا تھا محفوظ رکھا ہوا ہے یا نہیں۔ گو ہم نے تو اپنی Self کے اوپر بہت بڑے بڑے سائن بورڈ لگا لئے ہیں، اپنے نام تبدیل کر لئے ہیں، اپنی ذات کے اوپر ہم نے پینٹ کر لیا ہے۔ ہم جب کسی سے ملتے ہیں مثلاً میں آپ سے اس اشفاق کی طرح نہیں ملتا، جو میں پیدا ہوا تھا۔ میں تو ایک رائٹر ایک دانشور ایک سیاستدان، ایک مکار، ایک ٹیچر بن کر ملتا ہوں۔ اس طرح جب آپ مجھ سے ملتے ہیں تو آپ اپنے اپنے سائن بورڈ مجھے دکھاتے ہیں۔ اصل Self کہاں ہے وہ نہیں ملتی۔ اصل Self جو اللہ نے دے کر پیدا کیا ہے وہ تب

ہی ملتا ہے جب آدمی اپنے نفس کو پہچانتا ہے لیکن اس وقت جب وہ اکیلا بیٹھ کر غور کرتا ہے کوئی اس کو بتا نہیں سکتا۔ اپنے نفس سے تعارف اس وقت ممکن ہے جب آپ اس کے تعارف کی پوزیشن میں ہوں اور اکیلے ہوں۔ جس طرح خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔'' جس انسان نے خود کو پہچان لیا کہ میں کون ہوں؟ وہ کامیاب ہو گیا اور وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو باوجود اس کے کہ علم زیادہ نہیں رکھتے، اُن کی تعلیم بھی کچھ زیادہ نہیں لیکن علم اُن پر وارد ہوتا رہتا ہے۔ جو ایک خاموش آدمی کو اپنی ذات کے ساتھ دیر تک بیٹھنے میں عطا ہوتا ہے۔

میں پہلے تو نہیں اب کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہوں اور عمر کے اس حصے میں میری طبیعت پر ایک عجیب طرح کا بوجھ ہے، جو کسی طرح سے جاتا نہیں۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرتا ہوں۔ اب میں چاہوں گا کہ میں اپنی مشکل آپ کے سامنے بیان کروں اور آپ بھی میری مدد کریں کیونکہ یہ آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ آپ مجھ جیسے پریشان اور دردمند آدمی کا سہارا بن جائیں۔ ہمارے بابے جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی محفل میں کسی یونیورسٹی، سیمینار، اسمبلی میں، کسی اجتماع میں یا کسی بھی انسانی گروہ میں بیٹھے کوئی موضوع شدت سے ڈسکس کر رہے ہوں اور اس پر اپنے جواز اور دلائل پیش کر رہے ہوں اور اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسی دلیل آ جائے جو بہت طاقتور ہو اور اس سے اندیشہ ہو کہ اگر میں یہ دلیل دوں گا تو یہ بندہ شرمندہ ہو جائے گا کیونکہ اس آدمی کے پاس اس دلیل کی کاٹ نہیں ہو گی۔ شطرنج کی ایسی چال میرے پاس آ گئی ہے کہ یہ اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔ اس موقع پر ''بابے'' کہتے ہیں کہ ''اپنی دلیل روک لو، بندہ بچا لو اسے ذبح نہ ہونے دو کیونکہ وہ زیادہ قیمتی ہے''۔ ہم نے تو ساری زندگی کبھی ایسا کیا ہی نہیں۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ''میں کھڑکا ر پادیاں گا''۔ ہماری بیبیاں جس طرح کہتی ہیں کہ ''میں تے آپاں جی فیر سدھی ہو گئی اوہنوں ایسا جواب دتا کہ اوہ تھر تھر کنبن لگ پئی۔ میں اوہنوں اِک اِک سنائی۔ اُوہدی ماسی دیاں کرتوتاں، اُودھی پھوپھی دیاں وغیرہ وغیرہ۔''

خیر انسان کمزور ہے ہم بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ بڑی دیر کی بات ہے، 1946ء کی جب پاکستان نہیں بنا تھا۔ میں اس وقت بی اے کر چکا تھا اور تازہ تازہ ہی کیا تھا۔ ہمارے قصبے کے ساتھ ایک گاؤں تھا اس میں ایک ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول تھا وہاں کا ہیڈ ماسٹر چھٹی پر گیا۔ اس کی جگہ تین ماہ کے لیے مجھے ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ اب میں ایک پدا سا چھوٹے قد کا نوجوان بڑے فخر کے ساتھ ایک سکول کو ہینڈل کر رہا ہوں۔ گو مجھے زیادہ تجربہ نہیں ہے، لیکن میں زور لگا کے یہ بتانا چاہتا ہوں دوسرے ماسٹروں کو کہ بی اے کیا

ہوتا ہے کیونکہ وہ بیچارے نارمل سکول سے پڑھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ ہر نئے آدمی کی عادت ہوتی ہے یا جو بھی کسی جگہ نیا آتا ہے وہ ہمیشہ ٹھیک کرنے پر لگ جاتا ہے۔ یہ بندے کے اندر ایک عجیب بلا ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ میں سکول کا سسٹم ٹھیک کروں گا حالانکہ مجھے چاہیے تو یہ تھا کہ میں پڑھاتا اور بہتر طور پر پڑھاتا اور جیسا نظام چل رہا تھا، اُسے چلنے دیتا۔ لیکن میں نے کہا نہیں اس کا سسٹم بدلنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے کہا کہ یہ گملا ادھر نہیں اُدھر ہونا چاہیے۔ وہ جو سن فلاور سورج مکھی ہوتا ہے وہ مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ اس پیلے پھول کو میں نے وہاں سے نکال دینے کا حکم دیا۔ اب اگلا پھٹا پیچھے کر کے پچھلا آگے کر کے سسٹم تبدیل ہو رہا ہے۔ ''گملوں کو گیرو لگا دو سرخ رنگ کا''۔

''سفیدی کر دو''۔

''تمام ماسٹر صاحبان پگڑی باندھ کر آئیں''۔

اس طرح سکول میں سسٹم کی تبدیلی جاری تھی۔ ماسٹر بیچارے بھی عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ سکول میں چھٹی کے وقت پہاڑے کہلوائے جاتے تھے۔ چھ کا پہاڑہ ماسٹر صاحب کہلوا رہے تھے:

چھ اکیم چھ

چھ دونی بارہ

چھ تیا اٹھارہ

چھ چوکے چووی

میں نے سکول میں ایک شرط عائد کر دی کہ بچوں میں شرمندگی اور خفت دور کرنے کے لیے اُن کو سٹیج پر آنا چاہیے اور بلیک بورڈ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ پہاڑہ لکھنا چاہیے۔ چوتھی جماعت کا ایک لڑکا تھا اب مجھے اس کا نام یاد نہیں صادق تھا یا صدیق۔ اس نے تختہ سیاہ پر لکھنے سے انکار کر دیا کہ میں نہیں لکھوں گا۔ استاد نے کہا کہ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا حکم ہے تمہیں وہاں جا کر لکھنا پڑے گا، لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ شرماتا ہو گا بیچارہ گاؤں کا لڑکا۔ اسے میرے سامنے پیش کیا گیا۔ بتایا گیا کہ یہ لڑکا پہاڑہ تو ٹھیک جانتا ہے۔ لیکن بورڈ پر لکھتا نہیں۔ میں نے پوچھا: ''تم کیوں نہیں لکھتے'' اُس نے کہا: ''میں نہیں لکھوں گا'' میں نے اس کا کان پکڑ کر مروڑا اور کہا: ''کیا تجھے معلوم ہے کہ میں تجھے سخت سزا دوں گا کیونکہ تم میرے اُصول کے مطابق کام نہیں کر رہے'' اس نے کہا کہ جی میں یہ نہیں کر سکتا مجھ سے لکھا نہیں جاتا شرمیلا تھا شاید۔ میں نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ آپ ایسا کریں کہ اسے ساری کلاسوں میں پھرائیں اور سب کو بتائیں کہ یہ

نافرمان بچہ ہے اور اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات نہیں مانی۔ ماسٹر صاحب اسے میرے حکم کے مطابق لے گئے اور اُسے گھماتے رہے۔ دیگر استادوں نے بھی بادل نخواستہ اپنی طبیعت پر بوجھ سمجھ کر میرے اس حکم کو قبول کیا تاہم انہوں نے میری یہ بات پسند نہیں کی۔ جسے میں اپنی انتظامی صلاحیت خیال کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ لڑکا چلا گیا۔ اس کے بعد کبھی سکول نہیں آیا۔ اس کے والدین نے بھی کہا کہ جی وہ سکول نہیں جاتا۔ گھر پر ہی رہتا ہے۔ میں نے اپنے ایک فیصلے اور حکم سے اسے اتنا بڑا زخم دے دیا تھا کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکا۔ گو میں نے بدنیتی سے ایسا نہیں کیا تھا لیکن اب میں بیٹھ کر سوچتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ میں نے اتنے اچھے صحت مند پیارے بچے کے ساتھ کیا حماقت کی۔ اس وقت میرے ذہن میں Scare یعنی زخم کا لفظ نہیں آیا۔ تب میں سمجھتا تھا کہ پڑھانے کے لیے ایسا ہی سخت رویہ ہونا چاہیے۔

وہ زمانہ گزر گیا، پاکستان بن گیا۔ ہم ادھر آ گئے۔ وہ لوگ پتا نہیں کدھر ہوں گے۔ ایسے ہی مجھے پتا چلا کہ وہ گھرانہ ساہیوال چلا گیا تھا۔ باپ کو اُسے پڑھانے کا بڑا شوق تھا، خواہش تھی۔ اس نے بچے کو پھر سکول داخل کرایا لیکن وہ سکول سے بھاگ جاتا تھا۔ ڈرتا تھا اور کانپتا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ بہت سال بعد مجھے پھر معلوم ہوا کہ اس لڑکے نے بُری بھلی تعلیم حاصل کر لی ہے اور لاہور سے انجینئرنگ یونیورسٹی سے بی ایس سی بھی کر لی ہے۔ ایک اندازہ تھا لوگ مجھے آ کر یہ بتاتے تھے کہ شاید وہی لڑکا ہے کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ پچھلی سے پچھلی عید پر جب ہم نماز پڑھ چکے تب ہم عید کے بعد ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ معانقہ کرتے ہیں جپھی ڈالتے ہیں۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ آپ اس بندے کو جانتے ہیں یا نہیں۔ آپ کی صف میں جو بھی ہو اس سے معانقہ کیا جاتا ہے۔ کوئی واقف کار ہو یا نہ ہو۔ میرے ساتھ لوگ ملتے رہے اور ہم بڑی محبت سے ایک دوسرے کے جپھی ڈالتے رہے۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا تھا، وہ بھی کسی سے مل رہا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ میری طرف تو متوجہ نہیں ہوتا میں ہی اس کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور جب میں نے آگے بڑھ کر اسے جپھی ڈالنے کی کوشش کی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے پرے دھکیل دیا۔ اب میرا یقین ہے کہ یہ وہی لڑکا تھا۔ میں تو اس وقت بڑا تھا۔ وہ چھوٹا تھا تب اور وہ مجھے پہچانتا تھا۔ میں اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ اب میں اس کو تلاش کرتا ہوں اور بہت تکلیف میں ہوں اور اس بات کا آرزومند ہوں کہ کسی طرح سے مجھے اس سے معافی مل جائے۔

بظاہر تو یہ اتنی بڑی کوتاہی نہیں تھی لیکن جو واقعہ گزرا اور جس طرح سے اس کے دل کے اوپر لگا اور وہ زخم کتنے ہی سال گزرنے کے بعد بھی اس کے دل پر چلا آ رہا ہے اور اب وہ واقعہ ایک نئے روپ میں مجھے

پریشان کرتا ہے، دُکھ دیتا ہے۔ میں آپ سب سے درخواست کروں گا کہ بظاہر یہ بات معمولی لگتی ہے بظاہر ہم یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ میں نے اس کو ایسا پوائنٹ مارا کہ اس کی پھنکری پھل کر دی، لیکن ایک بندہ زندہ رہتے ہوئے بھی اپنے اندر کی لاش ساتھ اٹھائے پھرتا ہے اور آپ اس کے قاتل ہیں۔ اس کا دین، اس کی دیت، اس کا قصاص کس طرح ادا کیا جائے، یہ سمجھ سے باہر ہے۔ وہ کشمیری جن کو بھارتی گورنمنٹ اپنا اٹوٹ انگ کہتی ہے کہ یہ ہمارے بدن کا ایک حصہ ہیں مگر ان بھارتیوں نے گزشتہ 56 برسوں میں کتنے زخم کشمیریوں کو دیئے ہیں۔ جسمانی بھی، روحانی بھی، نفسیاتی بھی اور ہر طرح کے زخم اور وہ ساری کی ساری قوم بھارت کے سامنے ایسی ہی ہو گئی ہے جیسے وہ زخم لیے پھرتی ہو۔ کچلی ہوئی انا کا زخم، زبان کا زخم، اسلحے بارود کا زخم اور ان کی یہ کیفیت اجتماعی طور پر ہے۔

لوگ اکثر بیٹھے یہ باتیں کرتے ہیں کہ بھارتی فلموں کے بہت اچھے ناچ گانے ہوتے ہیں۔ وہ دھیمے انداز کی بیبیاں، ماتھے پر بندی لگاتی ہیں، تو اچھی لگتی ہیں۔ لیکن جس طرح کشمیریوں کا دُکھ محسوس کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں میں اتنی بڑی قوم کو ملاحظہ کرتا ہوں تو سارے کشمیر میں کوئی گھر ایسا نہیں جس میں بھارت کی فوج نے کوئی جانی نقصان نہ کیا ہو۔ اور پھر ساتھ ہی وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے بہت پیارے ہیں اور ہمارے بدن کا حصہ ہیں اور ہمارا اٹوٹ انگ ہیں۔ شاید ان کی کشمیریوں کے لیے محبت کا یہی انداز اور طریقہ ہے کہ وہ چھ سات لاکھ کی فوج کشمیر کے اندر بھیج کر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ایسی کوتاہیاں انفرادی طور پر بھی آدمی سے ہوتی ہیں اجتماعی طور پر بھی ہوتی ہیں۔ لیکن جب مسلسل اجتماعی رنگ میں ہونے لگیں تو اس کے باوجود بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہیں لیکن یہ کامیابی نہیں ہوتی۔ ہمارے اور اللہ کے ٹائم میں بڑا فرق ہے۔ ہمارا جو ایک دن ہے وہ اللہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں۔ پتا نہیں ہمارا کتنا ٹائم لگ جائے تو پھر اللہ کا ایک دن بنے۔ اللہ نے کہیں فرمایا بھی ہے کہ وقت کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ہمارے وقت سے مختلف۔ اب ہم اپنے ان کشمیری بھائیوں کا اور میں اپنے اس بچے کا جس کا میں ہیڈ ماسٹر بن گیا تھا اس طرح سے پراچت کر سکتے ہیں، ایسی تلافی کر سکتے ہیں کہ ہم ان کی بہتری چاہیں دل سے انہیں اچھا Wish کریں۔ یہ ایسی بات ہے جو دُعا سے بھی طاقتور ہوتی ہے۔ ہم ان کے ساتھ جا کر لڑ تو نہیں سکتے۔ میں اس کے اوپر یعنی Well Wishing پر کسی اگلے پروگرام میں بات کروں گا۔ دُعا لفظوں کے ساتھ مانگی جاتی ہے لیکن جب آپ کسی کے لیے Well Wish نیک خواہشات کے اظہار کے طور پر کریں، آرزو اچھی رکھیں اور آپ کسی کو کہہ دیں کہ غلام محمد بڑا اچھا آدمی ہے، اللہ اس کو بھاگ

لگائے۔ چاہے آپ کسی کو بے خیالی میں کہہ دیں پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ کی وہ دُعا قبول نہ ہو۔

ہمارے قدرت اللہ شہاب صاحب کا بھی سٹائل تھا۔ جو بھی ان سے دُعا کرنے کی درخواست کرتا آپ اُسے Well Wish کرتے۔ اکثر اس کا کام بن جاتا۔ آپ سب ان لوگوں کے لیے جو بڑے دُکھ سے گزر رہے ہیں اور بڑی تکلیف میں ہیں ان کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتے تو Well Wish ضرور کریں اور اگر آپ کے گھر کے اندر کوئی دیوار ہے اور کبھی آپ کو مغرب کا وقت میسر آئے تو آپ اس کے ساتھ ڈھو، ٹیک لگا کر بیٹھیں اور اپنے اللہ سے یہ ضرور کہیں کہ ''میں اپنے ان بھائیوں اور بہنوں کے لیے جن پر صریحاً ظلم ہو رہا ہے محض اس لیے کہ وہ مسلمان ہیں خدا ان پر رحم کرے اور کہیں کہ اے اللہ! میں ان کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا صرف Well Wish کر سکتا ہوں۔ اے اللہ! تو مدد فرما''۔ لیکن آپ کو اس کے لیے وقت نکالنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ آپ چلتے ہوئے رسماً پڑھ لیں اور اس طرح سے Well Wish اثر نہیں کرے گی۔ جو ہاتھوں کی زنجیر بنتی ہے، وہ تصویر کھینچنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ تصویر جو الگ بیٹھ کر آپ کھینچیں گے یہ اللہ کے دربار میں کھنچے گی اور اللہ اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ میرے لیے بھی یہ دُعا ضرور کیجئے گا کہ وہ نوجوان اب ماشاء اللہ اس کے بچے ہوں گے، مل جائے اور اتنا ناراض نہ رہے، جتنا ناراض ہونے کا اسے حق پہنچتا ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

☆☆☆

خدا کس کی سنتا ہے!

ہم اہل ''زاویہ'' کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ہم میز کے گرد جمع ہو رہے تھے تو ہم دریاؤں، پانیوں اور بادلوں کی باتیں کر رہے تھے اور ہمارے وجود کا سارا اندرونی حصہ جو تھا وہ پانیوں میں بھیگا ہوا تھا اور ہم اپنے اپنے طور پر دریاؤں کے منبعے ذہنی طور پر تلاش کر رہے تھے کیونکہ زیادہ باہر نکلنا تو ہمیں نصیب نہیں ہوتا۔ جغرافیے کی کتابوں یا رسالوں، جریدوں کے ذریعے ہم باہر کی دنیا کے بارے معلوم کرنا چاہتے ہیں اور معلوم کر بھی لیتے ہیں۔ دریاؤں کی باتیں جب ہو رہی تھیں تو میں سوچ رہا تھا کہ دریا بھی عجیب وغریب چیز ہیں اور ان کو کیسے پتہ چل جاتا ہے، نہ ان کا کوئی نروس سسٹم ہے نہ دماغ ہے پھر کس طرح سے دریا کو پتہ چل جاتا ہے کہ سمندر کس طرف ہے اور اسے ایک دن جا کے ملنا ہے بغیر کسی نقشے کے۔ دریا بغیر کسی سے پوچھے سمندر کی طرف رواں دواں ہے اور کہیں اگر اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں تو وہ دونوں چکر کاٹ کے مل کے پھر سمندر ہی کی طرف محو سفر رہتے ہیں اور بد قسمتی سے اگر دریا کی کوئی شاخ کسی ایسے مقام پر رک جاتی ہے جہاں بہت ہی سنگلاخ چٹان ہو اور وہ شاخ اس سے سر ٹکراتی ہے اور وہاں سر پھوڑتی ہے کہ مجھے مت روکو مجھے جانے دو اور سنگلاخ چٹان اسے کہتی ہے کہ میں تو سوا کروڑ سال سے یہاں کھڑی ہوں میں کیسے ایک طرف کو ہٹ جاؤں۔ وہ بھی دریا کی شاخ ضدی ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر تو مجھے نہیں گزرنے دے گی تو میں بھی یہاں کھڑی ہوں چنانچہ دریا کے اس پانی کے ساتھ جو اس سنگلاخ چٹان کے ساتھ ٹکرا کر کے رک جاتا ہے کیڑے پڑ جاتے ہیں وہاں، بھینسیں آ جاتی ہیں گوبر جمع ہونے لگتا ہے۔ بد بودار اور متعفن پانی گزرتا ہے اور اس کا وہ حصہ جو سفر پر رواں دواں تھا اور ایسی سنگلاخ چٹان آنے پر راستہ چھوڑ کے دوسری طرف سے گزر جاتا ہے وہ دریا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے

بالکل اسی طرح سے انسانی زندگی ہے جہاں انسان ضد میں آ کر رکتا ہے، لڑائی جھگڑا کرتا ہے تو پھر اس کے آگے بڑھنے اور منزل تک پہنچنے کے جو بھی مقامات ہیں وہ مسدود ہو جاتے ہیں۔ آج سے بہت عرصہ پہلے میرے خیال میں سو ڈیڑھ سو برس قبل کی بات ہے، لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ سندیلہ ہے وہاں کے لڈو اور شاعر مشہور ہیں۔ وہ شاعر بڑے اعلیٰ پائے کے ہیں۔ لکھنؤ میں بھی بڑے شاعر تھے لیکن سندیلے کے شاعر اصلاح دیتے تھے اور اس کی اُجرت وصول کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ سندیلے میں بہت زبردست Drought یعنی خشک سالی ہوگئی اور وہاں کے نواب اور چھوٹی چھوٹی راج دھانیاں تمام کی تمام سوکھے کا شکار ہوگئیں۔ اس قدر صورتحال خراب ہوئی کہ زمین کا کلیجہ خشکی سے پھٹنے لگا۔ جگہ جگہ پر پھٹی ہوئی زمین کے آثار نظر آنے لگے۔ ڈھور ڈنگر، مویشی مرنے لگے اور ان کے بڑے بڑے پنجر اور سینگ جگہ جگہ پڑے نظر آتے۔ پرندوں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ گئے تو پھر لوٹ کے نہیں آئے، لوگوں نے آ کر مکھیا کے پاس شکایت کی۔ وہ مکھیا لڑکھڑاتا نواب کے پاس گیا کہ حضور لوگ گاؤں چھوڑ کر جانا چاہ رہے ہیں لہٰذا نماز استقاء پڑھی جانی چاہیے کیونکہ اس طرح تو گاؤں ہی خالی ہو جائے گا۔ چنانچہ نماز استقاء ادا کی گئی لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا جس سے لوگوں کی مایوسیوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ہندوؤں نے کہا کہ ہم اپنا ناقوس بجا کر اور بھجن گا کر بھگوان کو راضی کرتے ہیں شاید وہ بارش بھیج دے۔ انہوں نے اپنا پورا زور لگایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ جب ڈھور ڈنگروں کے بعد انسان بھی مرنے لگے تو اس علاقے کی طوائفیں وہ سارے اُتر پردیش میں بہت مشہور تھیں اپنا چھوٹا سا گروہ لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہوں نے کہا کہ جنتا، عوام پر بہت کڑا اور بُرا وقت آیا ہے اور اس برے وقت سے ہم سب ماؤف ہو گئے ہیں۔ ہمارے ذہن میں ایک بات آتی ہے اگر ہمیں اس کی اجازت دی جائے تو ہم شاید اس علاقے اور آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔ نواب صاحب نے کہا کہ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے طوائفوں نے کہا کہ ہم بھی ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر کھلے میدان میں جا کر بیٹھیں گی اور ہم بھی کچھ گریہ زاری کریں گی لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی آدمی اس طرف نہ آنے پائے۔ اُن کی وہ شرط منظور کر لی گئی۔ وہ اپنے قیمتی گھروں اور سونے چاندی کے زیورات اور جو بھی کچھ ان کے پاس تھا اپنے بالا خانوں پر چھوڑ کر سیڑھیاں اُتریں۔ انہوں نے سفید رنگ کی نیلی کنی والی دھوتیاں باندھی ہوئی تھیں، جیسے کلکتے والی خواتین پہنتی ہیں۔ خاص طور پر جس طرح مدر ٹریسا پہنتی تھیں۔ ایک چرواہے نے یہ آنکھوں دیکھا حال بتایا تھا، حالانکہ کسی مرد کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ جب اس مخصوص جگہ پر آئیں تو انہوں نے گڑگڑا کر اللہ سے درخواست کی اے خدا تو جانتا ہے ہمارے

افعال کیسے ہیں اور کردار کیسا ہے اور ہم کس نوعیت کی عورتیں ہیں۔ تُو نے ہمیں بڑا برداشت کیا ہے۔ ہم تیری شکر گزار ہیں لیکن یہ ساری مصیبت جو انسانیت پر پڑی ہے یہ ہماری ہی وجہ سے ہے۔ اس علاقے میں جو خشک سالی آئی ہے وہ ہماری موجودگی سے آئی ہے اور اس ساری خشک سالی کا کارن ہم ہیں۔ ہم تیرے آگے سجدہ ریز ہو کر دل سے دُعا کرتی ہیں کہ بارش برسا اور اُن لوگوں اور جانوروں کو پانی عطا کرتا کہ اس بستی پر رحم ہو اور ہجرت کر کے جانے والے پرندوں کو واپس آنے کا پھر موقع ملے اور وہ یہاں خوشی کے نغمے گائیں۔ چرواہا کہتا ہے کہ جب انہوں نے سجدے سے سر اُٹھایا تو اتنی گھر کے سیاہ گھٹا آئی اور وہ چشم زدن میں بارش میں تبدیل ہوگئی اور ایسی زبردست موسلا دھار بارش ہوئی کہ سب جل تھل ہو گیا اور وہ عورتیں اس بارش میں بھیگیں اور ان کی بغلوں میں چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں تھیں جنہیں لے کر وہ ایک طرف کو نکل گئیں۔ پھر کسی نے نہ ان کا پوچھا اور نہ ہی ان کا کوئی پتہ چلا کہ وہ کہاں سے آئیں تھیں اور کدھر چلی گئیں۔ انہیں زمین چاٹ گئی یا آسمان کھا گیا لیکن ساری بستی پھر سے ہری بھری ہوگئی۔ ان طوائفوں کے گھروں کے دروازے کھلے تھے لوگوں نے ایک دو ماہ تو خود پر جبر کیا لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کا قیمتی سامان چرانا شروع کر دیا اور تاریخ دان کہتے ہیں کہ ان کے گھروں سے بڑی دیر تک ایسی قیمتی چیزیں برآمد ہوتی رہیں اور اناڑی چور اور پکے چور کئی سال تک وہاں سے چیزیں لاتے رہے۔ ان کی یہ Sacrifice ان کی یہ قربانی اور لوگوں کے ساتھ محبت اور تال میل اور گہری وابستگی کو جب میں آج کے تناظر میں دیکھتا ہوں اور آج میں اپنا اخبار پڑھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ ہم جو پڑھے لکھے لوگ ہیں جو اُن طوائفوں سے بہت آگے نکل کر پانی پر جھگڑا کرتے ہیں کہ اس صوبے نے میرے اتنے قطرے پانی کے چھین لیے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے تجھے اتنے قطرے زیادہ دے دیئے۔ ان بیبیوں جیسی بلکہ بازاری بیبیوں جیسی کام کی بات نہیں کرتا اور ایسی کوئی بات کسی کے دل میں نہیں آتی اور کوئی بھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ یہ پانی جو اللہ کی عطا ہے اور جو ہم کو جس قدر بھی مل رہا ہے اس کو بانٹ کے کس طرح استعمال کرنا ہے۔ جب بھی ایسی خبریں دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں اور دل میں ان طوائفوں سے منسوب، اس کہانی کا پس منظر آجاتا ہے تو میں اپنے ارد گرد کے لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم جو بہت اچھے بھلے اور پاکیزہ لوگ ہیں ان طوائفوں کی قربانی کے جذبے کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں تو مجھے ہر طرف سے چہروں پر نفی کے آثار ملتے ہیں کہ نہیں ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ہم کیسے اس Source کو ڈھونڈ سکیں اور پانی کے اس منبعے تک پہنچ سکیں جو ہماری روحوں کی آبیاری کرے لیکن یہ ہو نہیں پاتا۔ اس کی طرف ہم جا نہیں سکتے۔

بہت ممکن ہے کہ میرے پیارے مہمانوں (حاضرین "زاویہ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں سے کوئی مجھے تھوڑی سی Guidence اس حوالے سے عطا کرے کہ کس طرح سے ہم اس منزل تک پہنچ سکیں جس منزل پر وہ پاکیزہ بیبیاں ایک ہی فیصلے پر پہنچ گئیں۔

(پروگرام میں سوال و جواب کا سیشن شروع ہوتا ہے)

اشفاق احمد صاحب سوال کرتے ہیں: "شہزاد صاحب! وہ بیبیاں ایک ہی فیصلے پر پہنچ گئیں اس حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے؟"

شہزاد صاحب: "آپ نے یہ جو سوال اٹھایا ہے یہ آپ کے لیے بھی بہت مشکل سوال ہے اور ہم سب کے لیے بھی مشکل ہے۔ اصل میں جو کہانی آپ نے بیان کی، اس کے جو معانی میرے ذہن میں آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہم سب اپنے اپنے گناہوں اور اعمال کی ذمہ داری قبول کریں اور پھر اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنی ہی اصلاح کریں بلکہ کسی بہت بڑی قربانی کے لیے تیار ہو جائیں اور یہ گلہ نہ کریں کہ کس کو کتنا پانی ملا اور کس کو کتنا پانی نہیں ملا۔ اس سے ایک ایسی بارش ہو سکتی ہے جو ہم سب کو سیراب کر دے۔"

اشفاق احمد صاحب: "ہماری اس محفل میں ڈاکٹر توفیق صاحب بھی موجود ہیں۔ ان کے پاس بھی بڑے مریض آتے ہیں اور یہ بڑے نیکی کے کام کرتے ہیں۔ ان سے بھی پوچھا جائے کہ ہم میں کس طرح سے وہ جذبہ پیدا ہو جو آپ میں ہے کیونکہ میں نے آپ کو لگن اور محبت سے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے جبکہ اس کے برعکس ہم رُکتے اور گھٹتے ہیں۔ ہم بھی پھیلنا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر توفیق: "میرا خیال ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں اور ایک دوسرے سے جو توقعات ہم رکھ رہے ہیں ان توقعات کا دائرہ بھی جانچیں اور ایک دوسرے کو چیزیں دینے کی ہمت بھی رکھیں۔ صرف لینے پر ہی مصر نہ رہیں۔ جب یہ سارے جذبے ہم میں آ جائیں گے تو ہم مل بیٹھ کے پانی کے قطروں کو جو بھی ہمارے پاس ہیں، ان کو خوش اسلوبی سے بانٹ لیں۔"

اشفاق احمد: "پروین اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

بیگم پروین عاطف صاحبہ: "میں سمجھتی ہوں کہ میرا جو اپنا زاویۂ نظر ہے وہ یہ ہے کہ جیسے توفیق صاحب نے فرمایا کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھیں گے تو ہم قطرے بانٹیں گے مجھے یہ نہیں لگتا کہ میں اور آپ اس میں قصوروار ہیں یا کہ ہم لوگ اپنی سطح پر غلطی پر ہیں۔ ہمیں ان عناصر کے مذموم مفادات کو پن پوائنٹ کرنا ہوگا جو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد اور فوائد کے لیے اس طرح کی بانٹ یا اس طرح کی بندر بانٹ ہم کو

سکھاتے ہیں۔ اگر ہم میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار ہو جائے اور ہم سمجھیں کہ اتفاق اور محبت سے ہی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ وہ بیبیاں جن کی مثال دی گئی ہے وہ متحد ہو کر جنگل میں گئی تھیں۔ اور اُن کے دل میں درد تھا اور انہوں نے اپنا ذاتی فائدہ چھوڑ دیا تھا تب وہ مسئلہ حل ہوا تھا۔ ہمارے اوپر جو بھی مسائل آ رہے ہیں وہ پانی کے ہوں یا اناج کے اس میں Vasted Interest کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔"

اشفاق احمد: "چونکہ پانی کی باتیں ہو رہی ہیں اور ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ گلیشیر پگھلا کر اپنے آئندہ مصارف کے لیے پانی حاصل کریں گے تو مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ ہم ناران جا رہے تھے اور ہمیں یہ کہہ کر روک دیا کہ گلیشیر کی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو ایک دو دن یہاں بالاکوٹ میں قیام کرنا پڑے گا۔ بالاکوٹ میں تب ایسا کوئی ہوٹل نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ ممتاز مفتی صاحب بھی تھے۔ وہ کہنے لگے یار ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ مسافر مسجد میں وقت گزارتے تھے تو چلو کسی مولوی صاحب سے پوچھتے ہیں۔ ہم پانچ آدمی تھے مولوی صاحب کے پاس گئے ان سے کہا کہ آپ کیا ہمیں مسجد میں رہنے کی اجازت دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں جی کیوں نہیں۔ ادھر برآمدہ ہے، صف ہے مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ایسی کوئی دری نہیں جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا۔ ہم نے کہا کہ نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہمارے پاس Sleeping Bages ہیں۔ مولوی صاحب بھی وہ سلیپنگ بیگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ یہ بڑی مزیدار چیز ہے کہ اس کے اندر آدمی گھس جائے اور سکون سے سو جائے۔ ہم ایک دو دن وہاں ویسے ہی سوتے رہے۔ ابھی ہمیں آگے جانے کی کلیئرنس نہیں مل رہی تھی۔ وہ مولوی صاحب بھی عجیب وغریب آدمی تھے ان کے گھر کے دو حجرے تھے۔ ہم سے کہنے لگے۔ ممتاز مفتی اُن کے بڑے دوست ہو گئے۔ میرے ساتھ چائے پئیں وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور جس کمرے میں ہمیں بٹھایا اس میں ایک صندوقچی تھی بیٹھ کر وہ جس پر لکھتے تھے اور باقی صف بچھی ہوئی تھی۔ ممتاز مفتی تھوڑی دیر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگے کہ مولوی صاحب! آپ کا سامان کہاں ہے تو وہ کہنے لگے آپ ہم کو بتاؤ کہ آپ کا سامان کدھر ہے؟ ممتاز مفتی کہنے لگے میں تو مسافر ہوں۔ مولوی صاحب نے کہا میں بھی تو مسافر ہوں۔ کیا جواب تھا۔ اس طرح کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کا ایک خادم تھا وہ اذان دیتا تھا۔ اس نے واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ اندر آ کے کبھی ایک اور کبھی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالتا تھا۔ میں سمجھا کہ اسے کوئی خارش کا مرض لاحق ہو گا یا ایک "جھولے" کا مرض ہو جاتا ہے اسے وہ ہو گا۔ وہ بار بار جیب دیکھتا تھا۔ اس سے مجھے بڑا تجسس پیدا ہوا۔ میں نے کہا مولوی صاحب آپ کا یہ خادم کیا بیمار ہے۔ کہنے لگے نہیں اللہ کے فضل سے بہت صحت مند بہت

کہنے لگے جی یہ ہر وقت جیب میں ہاتھ ڈال کے کچھ ٹٹولتا رہتا ہے۔ میں نے کہا جی یہ ہر وقت جیب میں ہاتھ ڈال کے کچھ ٹٹولتا رہتا ہے۔

اچھا اور نیک آدمی ہے۔ میں نے کہا جی یہ ہر وقت جیبوں کی تلاشی لیتے رہتے ہیں کہ اس میں یہ اللہ والا آدمی ہے اور خدا کے اصل بندے جو ہیں وہ ہر وقت جیبوں کی تلاشی لیتے رہتے ہیں کہ اس میں کوئی چیز تو نہیں پڑی جو اللہ کو ناپسند ہو۔ میں نے کہا کہ ہم تو بڑے بد نصیب ہیں اور اس شہر سے آئے ہیں جہاں ناپسند چیزیں ہم جیبوں میں ہی نہیں دل کے اندر تک بھرتے ہیں اور بہت خوش بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح کے آدمی یا کردار جب پیدا ہونے لگیں گے تو پھر ظاہر ہے کہ کچھ مشکلات دور ہوں گی اور یہ کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے اور ایک دوسرے کو جاننے کے لیے ہمیں شاید وقت درکار ہو یا ہمیں اپنے اردگرد کے لوگ ویسے نہ نظر آتے ہوں جیسے نظر آنے چاہئیں یا وہ Level ہم نے Create ہی نہ کیا ہو جو بڑے مہذب ملکوں نے کیا ہوا ہے یا جو ہمارے سامنے اور دیکھتے دیکھتے چائنا نے Create کر لیا ہے۔ ہمارے چودہ کروڑ عوام ایک طرف ہیں اور ہم جو مراعات یافتہ لوگ ہیں ہم نے انہیں خود سے الگ کیا ہوا ہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان ایک بہت بڑی گہری کھائی ہے جو کبھی تو پانی سے بھر جاتی ہے اور کبھی سوکھ جاتی ہے اور پانی سے خالی ہو جاتی ہے۔ اب اس مکالمے میں ہم عطاء الحق قاسمی سے پوچھتے ہیں کہ ہم وہ کونسا راستہ پکڑیں جس میں ہم لوگوں کو آسانیاں عطا فرمائیں اور یہ معاشرتی مسائل جو پیدا ہوتے ہیں یہ پیدا نہ ہوں۔“

عطاء الحق قاسمی: ”اشفاق صاحب! آپ نے جو حقائق بیان کیے ہیں اور جو حکایت بیان کی ہے وہ اس قدر دلچسپ ہے اور اس میں اتنے معانی پوشیدہ ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ میں آپ ہی کی بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ ہم 14 کروڑ عوام سب بہت اچھے ہیں۔ ہم میں سے کچھ کو چاہیے کہ اپنے آپ کو برا سمجھیں اور جا کر ان ہی بازاری عورتوں کی طرح گریہ زاری کریں تب شاید ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔“

اشفاق احمد: ”عاصم قادری صاحب! آپ بھی کچھ فرمائیں۔“

عاصم قادری: ”لوگ ایثار و قربانی کی شیئرنگ اور مل بانٹنے کی بات کرتے ہیں۔ ہم لوگ ہر گھنٹہ ہر منٹ ایک ایسی بے یقینی اور غربت کی طرف چلتے چلے جا رہے ہیں جہاں پر سوچ کی Maturity ہم سے بہت دور ہے اور ہم میں چھین کے کھا لینے کی حس بیدار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آپ اس مسئلے کو جو مسئلہ ہر دن ہمیں غربت اور بے یقینی کی جانب گھسیٹتا چلا جا رہا ہے اس کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔“

اشفاق احمد: ”ہمارے درمیان نیلم احمد بشیر تشریف رکھتی ہیں۔ وہ اس عہد کی بہت معتبر نوجوان افسانہ نگار اور قلم کار ہیں اس سلسلے میں جس میں ہم پھنسے ہوئے ہیں اس کی بابت ان سے پوچھتے ہیں۔“

نیلم احمد بشیر: ”اشفاق صاحب کی بیان کردہ حکایت سے دو باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ ایک

یہ کہ جن خواتین کا انہوں نے تذکرہ کیا انہیں معاشرتی طور پر اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن پھر بھی ان کے دل میں ایک مقصد تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خدا سے دُعا کی اور وہ ایک عظیم تر مقصد تھا۔ دوسری بات جو پانی کی ہے یہ مسئلہ روز اخباروں میں آتا ہے اور اس سے ہم کافی افسردہ بھی ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہم سب میں Tolerance کی کمی ہے۔ برداشت کا مادہ شاید کم ہو گیا ہے اور ایک دوسرے کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی کافی کم ہے اس لیے اگر ہم میں سے کچھ قطرے کسی کو زیادہ مل جاتے ہیں یا کچھ کم تو ہم لوگ واویلا مچا دیتے ہیں جبکہ یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے اگر ایک صوبے کو پانی ملے گا اور دوسرے کو نہیں تو یہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ سارے ملک کو پانی ملے گا اور فصلیں پیدا ہوں گی تو سب ہی خوشحال ہوں گے۔"

(عطاء الحق قاسمی درمیان میں بولتے ہیں)

"اشفاق صاحب اس حوالے سے ایک بہت ضروری بات میں کہنا چاہ رہا ہوں اور وہ اخباروں کے کردار کے حوالے سے ہے۔ اخبارات اس ایشو کو جس طرح اُٹھاتے ہیں میں سمجھتا ہوں وہ بالکل قومی مفاد میں نہیں ہے۔ سیکرٹریوں کی جو میٹنگز ہوتی ہیں یہ بات وہیں تک رہنی چاہیے جبکہ اس کے برعکس یوں لگتا ہے کہ جیسے دو صوبوں کی صف آراء ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف طبل جنگ بجا دیا گیا ہے۔ یہ صورتحال قطعاً قومی مفاد میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اخبارات کو اپنا کردار بہت احتیاط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔"

اشفاق احمد: "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اور گھوم پھر کے بات پھر اُسی مرکز پر آ جاتی ہے کہ جب تک ہم میں تعلیم کا فقدان رہے گا اور جب تک تعلیم یافتہ لوگوں کی تربیت درست انداز خطوط اور سطح پر نہیں ہوگی اس وقت تک ہم ایسی الجھنوں کا شکار ہوتے رہیں گے، اور اس میں مبتلا ہوتے رہیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جو صاحبان اختیار واقتدار ہیں اور جن کے ہاتھ اور قبضے میں لوگوں کی زندگیوں کی قدرت ہے ان کو دوبارہ اپنے آپ کو بھی درست کرنا چاہیے اور اس تعلیم کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ اس حوالے سے تربیت کی واقعی ضرورت ہے۔ تربیت حاصل کرنے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کیا جانا چاہیے اور میں تو اکثر ایک ہی بات کہا کرتا ہوں کہ جب تک آپ اپنے 14 کروڑ باقی بھائیوں کو اُن کی عزت نفس نہیں لوٹائیں گے آپ پوری طرح سے بٹے رہیں گے اور کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اُن کو ان کی عزت لوٹا دیجیے اور اُن کو سلام کیجئے۔ آپ کے گھر دانوں سے بھر جائیں گے اور آپ کی چاٹیاں مکھن سے لبریز ہو جائیں گی۔ آپ سے اجازت لوں گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

☆☆☆

احساس

آج تک تو ہم بیشتر بابوں کے بارے میں ذکر کرتے آئے ہیں۔ آج مجھے ایک چھوٹے سے بچے کی یاد بہت ستا رہی ہے، جو ایک مرتبہ اپنے ماں باپ کے بغیر، اور شاید ان سے اجازت لیے بغیر ڈیرے پر آ گیا تھا، وہ گول مٹول سا، پیارا سا بچہ تھا۔ بڑا بنا ٹھنا تھا، اور آ کے بابا جی سے روتے ہوئے کہنے لگا، کہ مجھے اپنے ابا جی سے اختلاف، شکایت ہے میں شکایت لگانے آیا ہوں۔ تو انہوں نے پوچھا، ابا جی سے ایسی کیا شکایت ہے بیٹا بیٹھو۔ کچھ لو کھاؤ پیو، مٹھائی وغیرہ رکھی تھی نا۔ تو اس نے کہا نہیں میں کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ پوچھا، شکایت کیا ہے۔ اس نے کہا یہ بھی نہیں بتاؤں گا میں۔ بس مجھے ہے۔ وہ آپ کے پاس آتے ہیں، اور وہ بڑا دعویٰ کرتے ہیں محبت کا اور شرافت کا، لیکن وہ ان میں ہے نہیں۔ السلام علیکم کہہ کر وہ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ تو بابا جی نے کہا اس کے پیچھے جائیں اور اس کو منا کر لائیں لیکن وہ بڑے غصے میں تھا، چوتھی پانچویں کا لڑکا ہو گا لیکن رکا نہیں اور وہ چلا گیا، اور اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا اور نہ یہ پتا چلا کہ اس کے والد کون ہیں اور کس کے خلاف شکایت لے کر آیا تھا؟ لیکن وہ شکایت ہمارے ذہن کے رجسٹروں میں درج کر گیا، اور ظاہر ہے ہم اس کا کوئی قلع قمع نہ کر سکے، کیونکہ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کدھر سے آیا ہے۔ تو میں اس کی یاد میں جو کہ بڑی دیر کے بعد آئی ہے اور اب وہ کہیں اللہ کے فضل سے بڑے عہدے پر ہو گا، یا کوئی تاجر ہو گا، یا سیاست میں داخل ہو چکا ہو گا۔ وہ اگر کہیں ہمارا پروگرام دیکھ رہا ہو تو اس کو ہمارا بہت سلام پہنچے۔

ہوا یہ کہ ہم پاکستان بنا چکے تھے، اور وہ زمانہ درمیانی مدت کا زمانہ تھا، یعنی ہمیں کچھ آدھا وقت گزر چکا تھا بیس بائیس سال۔ اور ہم لوگ competition کے میدان میں اتر چکے تھے۔ مسابقت کے میدان میں مقابلہ کے میدان میں اور ہم competition کو ہی اپنی زندگی کا معیار اور ذریعہ بنا چکے

تھے۔ شرافت کا نجابت کا، آگے بڑھنے کا یہ جانتے ہوئے کہ competition جو ہے یہ تخلیقی صلاحیت کی راہ میں ایک بہت بڑا پتھر ہے۔ ایک آدمی کے اندر جو تخلیقی صلاحیتیں ہوتی ہیں نا۔ کچھ کرنے کی، کچھ کر گزرنے کی صلاحیت لیکن وہ competition میں اپنا آپ بھی بھلا چکا ہوتا ہے۔ وہ پھر ایک انسان نہیں رہتا وہ competition کی ایک مشین بن جاتا ہے اور دن رات اسی میں الجھا رہتا ہے۔ وہ ساری صلاحیتیں جو انسان میں ہوتی ہیں وہ ماؤف ہو جاتی ہیں۔ بظاہر یہ بات نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے جب بھی آپ competition کرتے ہیں وہ انسان کے خلاف کرتے ہیں۔ کبھی بھی کسی پتھر کے، کھمبے کے، سٹریٹ لائٹ کے، پل کے خلاف نہیں کرتے ہیں۔ بھینس کے خلاف آپ نے کبھی competition نہیں کیا جب بھی کرتے ہیں انسان کے خلاف کرتے ہیں۔ اور جب انسان کے خلاف کرتے ہیں، اور آپ کامیاب ہو جاتے ہیں اور کامیاب ہو کر تیس بندوں کو گرا دیتے ہیں۔ تو پھر پوچھتے ہیں کہ آپ تو کامیاب ہو گئے۔ اسلام میں Competition کی یہ Spirit یہ صورت بالکل منع ہے۔ ایک ہی اجازت ہے اور وہ ہے تقویٰ کے لیے آپ اس میں مسابقت کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ہونے میں مسابقت پیسے کمانے میں حسین بننے میں شیمپو اعلیٰ درجے کا استعمال کرنے میں، کپڑے استعمال کرنے میں، یہ کوئی کمال کی بات نہیں۔ لیکن آدمی اس میں Competition کرتا ہے۔ میری بچیاں کہتی ہیں کہ نہیں دادا یہ تو قمیص ہم پہن کے نہیں جائیں گی یہ تو پہلے بھی ہم پہن کے گئی تھیں سہیلی کی مہندی کے اوپر۔ یہ ہماری بے عزتی ہے۔ ایک دفعہ پہن لی، کیونکہ یہ competition ہے۔ زندگی کے جو زمینی competition ہیں، وہ انسان کو بڑا تنگ کرتے ہیں۔ اور اس کی صلاحیتوں کے اوپر ایک جال ڈال دیتے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہو گا، آپ تو سمجھتے ہیں کہ competition بہت Healthy فضا میں پیدا ہوا۔ کوشش، جدوجہد، سٹرائیو Strive سٹرگل، بھاگ دوڑ یہ ساری کی ساری آپ کے اندر انا اور تکبر پیدا کرتی ہیں۔ آپ دیکھیے امریکہ کو، آپ کے سامنے مثال ہے کتنی بھاگ دوڑ کرتا ہے کتنا تردد کرتا ہے، کتنا competition کرتا ہے، کتنا اعلیٰ درجے کا ملک ہے اور کیسا متکبر ہے۔ کسی کی کوئی بات بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ کہتا ہے جو میں فیصلہ کرتا ہوں وہی ٹھیک ہے جو میں نے حکم دے دیا عراق کے بارے میں وہ ٹھیک۔ تو یہ بہتر انسان ہونے کی خاصیت نہیں ہے۔ اسی لیے ہمارے یہاں پر حکم ہے کہ آپ competition نہیں کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک عجیب سی بات آپ سے کرنے لگا ہوں، آپ کے چہرے دیکھ کر۔ اُمید ہے آپ انشاء اللہ تعالیٰ اتنا برا نہیں مانیں گے جتنا عام لوگ مانتے ہیں۔ ایک بچہ کلاس میں

فسٹ آتا ہے۔کوئی تیس بچوں کی کلاس میں سے اب وہ تو فسٹ آگیا اور تیس بچے جو ہیں وہ تو Down وہ تو منہ کے بل گر گئے نا، زمین پر۔ اور ان کو شرمندہ ہونے کا موقع ملا۔ تو میرا دین پوچھتا ہے کہ یہ بھی تو Human being ہیں یہ انسان ہیں۔ ان کا کیا بندوبست آپ نے کیا ہے۔ آپ نے تو ایک دکان بنا لی، اور بڑے کمال کی چلالی۔ ایک لاکھ روپیہ روز کمانے لگے اور باقی کے بھی بندے آپ کے ارد گرد رہتے ہیں۔ ان کو بھی زندہ رہنا ہے۔ یہ بھی اللہ نے پیدا کیے ہیں جس طرح آپ کو حیات ملی ہے ان کو بھی زندگی ملی ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں اس کے اوپر تکبر کرنے والے کہ جناب ہم نے بہت بڑا کمال کیا۔ تو یہ بندے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ competition کی دنیا میں داخل ہو کر اپنی انسانی صلاحیت اور انسانی تخلیقی قوت جو ہے اُس کو دبا دیتا ہے۔ یہ آج میں بہت عجیب بات آپ سے کر رہا ہوں، جو کہ عام طور پر نہیں کی جاتی ہے۔ اس وقت ہم تو یہی کہتے ہیں کہ competition ہمارا بہت اچھا ہے۔ تو باقی کے بندے کیا کریں؟ کیا وہ مرتے ہیں تو مریں اور یہ بات میں نے اس لیے شروع کی کہ پہلے تو یہ بڑوں میں بات تھی۔ اب یہ ہمارے گھروں میں پہنچ چکی ہے۔ اور میں نے Recently دیکھا کہ یہ بات بچوں میں بھی اُتار دی گئی ہے۔ اور بچے جو پڑھتے ہیں آپ جیسے ان کو بہت شرمندہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے شرمندہ کیا جاتا ہے کہ میں آپ کو اس کی مثال یہ دیتا ہوں کہ میرے گھرانے میں جو پڑھے لکھے لوگوں کا گھرانہ ہے۔ میں نے اپنے بہت قریبی عزیز جو میرے بچوں کی طرح مجھے عزیز ہے وہ لڑکا اپنی بہن سے یہ کہہ رہا تھا اپنے بھانجوں کے بارے میں کہ ''آپا تیرے منڈے دے کنے نمبر آئے نیں۔'' لڑکا بھی وہیں کھیل رہا تھا۔ اس نے کہا اس کے تو 680 نمبر ہیں۔ کہنے لگا اوہ یہ کوئی نمبر ہیں۔ پھر کہنے لگا، میرے لڑکے نے لیے ہیں اور دبا کے لیے ہیں 730۔ ٹھیک ہے۔ کہنے لگا 730 کیا آپاں نمبر ہی نمبر کر دیئے۔ گھر میں نمبر، اوپر نمبر، چوبارے میں نمبر وہ کیا سیڑھی پر نمبر ہمارے برانڈوں میں نمبر ہی نمبر۔ میرے کان کھڑے ہوئے جب اس نے کہا نا کہ ہر جگہ نمبر ہی نمبر بکھرے ہوئے ہیں، ہمارے گھر میں۔ میں نے کہا شاید پتا نہیں یہ کیا بات کر رہا ہے پھر میں نے اس کی بات غور سے سنی، اور میں نے محسوس کیا کسی خوفناک بیماری کا انجکشن دے کر کوئی اس بے چاری کو جو میری نواسی ہے چلا جا رہا ہے۔ تو میں نے اس کو بلا کر کہا یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس پر میری بھانجی بولی نانا یہ تو بڑی خوبی کی بات ہے اس نے زیادہ نمبر لیے تو آپ فخر کریں۔ میں نے کہا اس نے زیادہ نمبر لیے لیکن کسی ایسے باپ پر فخر کرنا نہیں چاہیے جو اس کی طرح سے ہذیان بکنے لگ جائے، جیسے یہ کر رہا ہے وہ بھی انسان ہے وہ تیری سگی بہن ہے اس کا بھی دل ہے اس کا بھی گھر ہے اس کا بھی بچہ

ہے جیسا بچہ تجھے عزیز ہے ویسے ہی اس کو عزیز ہے۔ اس نے کہا نہیں جی اگر کوئی کمزور ہوگا تو ہم تو اسے شرمندہ کریں گے۔ کہنے لگا، دیکھیں اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر کتنا فضل کیا ہے۔ میں کم از کم پانچ ہزار روز کا کماتا ہوں اور ہے کوئی ہمارے خاندان میں ایسا آدمی، وہ ایک اکیلا آدمی نہیں ہے۔ آپ اپنے اردگرد اپنے گھروں کے اندر اپنے شہر کے اندر دیکھیں۔ لوگ آپ کو مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے اور شرمندہ کرنے کے لیے کیا کیا طریقے استعمال کرتے ہیں۔ ایسے طریقے جن کی مناہی ہے، جو ہمارے یہاں ایک حرام چیز تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا، آپ نے کبھی انا اور تکبر کے بارے میں سوچا ہی نہیں، آپ یہ competition کرنے والے مسابقت کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ تکبر کا جو گناہ تھا وہ تو ابلیس نے کرلیا اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم تو بالکل تکبر نہیں کرتے۔ یہ تو جی کھلے میدان ہم کام کرتے ہیں۔ دوسرا ابھی ہے تو میدان میں آئے۔ ہم کہتے ہیں کہ کسی وجہ سے دوسرا نہیں آ سکے گا تو کیا تم اس کو شرمندہ کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ تمہیں اللہ نے صرف یہ صلاحیت دی ہے تم اپنا موبائل ٹیلیفون لٹکا کے سارے محلے میں اس لیے چلتے ہو کہ میرے پاس موبائل ہے اگر ہے اور اس کو سچ مچ استعمال کرتے ہو، تو اسے بند رکھو۔ اس کو چھپا کے رکھو کیوں اس غریب کو دکھاتے ہو جس کے پاس نہیں ہے۔ اگر تمہارے پاس اعلیٰ درجے کی کار ہے اور میرے پاس چھوٹی ہے تو تم مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو کہ لا کے میرے منہ کے آگے کھڑی کر دیتے ہو کہ اشفاق صاحب اپنی چھوٹی سی پدی گاڑی نہ نکال سکیں، تو مجھے بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے یہ زمین میری بھی ہے یہ ملک میرا بھی ہے اور جو نعمت آپ کو اللہ نے عطا کی ہے وہ مجھے بھی عطا کی ہے اور پھر بیوقوف لوگو تم یہ سمجھتے ہو کہ سب کچھ تمہاری کوششوں سے تمہاری جدوجہد سے تمہارے competition سے تمہاری بھاگ دوڑ سے تم کو ملا ہے؟ نہیں! یہ خدا کی عطا ہے۔ اس کا شکر یہ ادا کرو، اور جوں جوں عطا میں اضافہ ہوتا جائے، توں توں سرنگوں ہوتے جاؤ، نیچے سر جھکاتے چلے جاؤ۔ تو میں جس چھوٹے بچے کا ذکر کر رہا تھا، کوئی تقریباً ایک ہفتے کے بعد اس کا باپ ہمارے ڈیرے پر وہیں آیا، بابا جی کے پاس اور کہنے لگا، میرا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ بُرا حال، رو رہا تھا، اور چاروں طرف پولیس کو اطلاع دی ہے، اخباروں میں اشتہار دیا ہے سلائیڈیں چلائیں، ٹیلی ویژن پر اس کا اعلان کیا لیکن اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا اور وہ میرا نورِ نظر ہے۔ اس کی ماں کی ظاہر ہے اور بھی بری حالت ہوگی۔ بابا جی نے کہا وہ تو یہاں آیا تھا۔ کہنے لگا یہاں آیا تھا؟ کہنے لگا، ہاں کچھ شکایت کرتا تھا لیکن وہ اتنا دکھی تھا کہ ہمارے قابو نہیں آ سکا۔ ہم نے بہت بہلانے اور پھسلانے کی کوشش کی وہ بیچ میں سے کھسک کر نکل گیا۔ اُس نے کہا جی ہوا کیا کوئی

خاص بات تو ہوئی نہیں ایسے ہی وہ حساس تھا اور ناراض ہو گیا بغیر سوچے سمجھے۔ بات یہ تھی کہ اس نے امتحان دیا اس میں اس کے کچھ کم نمبر تھے۔ جیسا ہوتا ہے بچوں کے ساتھ۔ تو سارے اس کو گھر میں عزیز رشتے دار موٹو کہہ کر پکارتے تھے۔ موٹو اس کا نام رکھا ہوا تھا۔ نک نیم جیسے ہمارے گھروں میں بے ہودہ چیز ہوتی ہے تو اس کو موٹو کہہ کر پکارتے تھے۔ تو وہ برداشت کرتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا پیار تھا جیسے باپ کے ساتھ بچے کا پیار ہوتا ہے تو شام کو میں آیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کے نمبر کم آئے ہیں سیکنڈ ڈویژن میں اس نے پاس کی چوتھی۔ تو میں نے اس سے کہا او موٹو تیرے نمبر کم آئے ہیں۔ کہنے لگا، میں نے پہلی دفعہ اس کو موٹو کہا، سات سو آدمیوں کے موٹو کہنے سے وہ مائنڈ نہیں کرتا تھا، برا نہیں سمجھتا تھا لیکن صرف ایک میرے کہنے سے اس کو اللہ جانے کیا ہوا، اس نے اس کو برداشت نہیں کیا، اور وہ گھر سے بھاگ گیا۔ سات آٹھ دن ہو گئے ہیں ہم اس کو تلاش کرتے پھرتے ہیں پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ تو یہ نمبروں کی کمی اور اس کی تضحیک اور تذلیل۔ خدا کے واسطے میں آپ سے دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ انسان کی تذلیل نہ کیا کریں ہمیں اس کا حکم نہیں ہے۔ ایسے بالکل نہ کریں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پورے کا پورا ایک جیسا پیدا کیا ہے۔ یہ زندگی جو لے کر آپ پیدا ہوئے ہیں یہ آپ کی محنت، کوشش، جدوجہد سے نہیں ہوئی، یہ آپ لے کر بیٹھے ہوئے ہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہے، اگر آپ یہ کہیں کہ بڑی بھاگ دوڑ کی پھر میں پیدا ہوا اور میں نے بڑی کوشش کی یہ غلط ہوگا۔

سب سے بڑی نعمت تو آپ کو مفت ملی ہوئی ہے۔ یہ زندگی، اور دوسرے کو بھی ایسی ہی زندگی ملی ہے۔ اب ہم کو بھی اس بات کی بڑی فکر ہوئی۔ وہاں مشترکہ دعا ہوئی سارے لوگ بڑے غمناک ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کے دعا کی کہ اللہ اس کو صحیح وسلامت رکھے اور جہاں بھی ہے وہ واپس آئے اور یہ کوتاہی جوان صاحب سے اس باپ سے ہوئی دوبارہ نہ ہو۔ کہنے لگے آپ تو سمجھدار آدمی ہیں، سیانے آدمی ہیں یہاں آتے رہتے ہیں۔ کچھ کام کی باتیں آپ کے کان میں پڑتی رہتی ہیں۔ پڑتی رہی ہوں گی۔ آپ کو تو یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے تھا الفاظ گولیوں کے مانند ہوتے ہیں انہیں استعمال کرنے سے پہلے چیمبر کو صاف کر کے استعمال کریں جس طرح آپ پستول کو صاف کرتے ہیں اور گولیوں کو ایک طرف رکھ لیتے ہیں اسی طرح آپ گفتگو کے لیے جب اپنا منہ یا دل استعمال کریں تو دیکھیں کون سی گولی چلانی ہے کون سی نہیں چلانی۔ آپ کے اردگرد اگر آپ کے پیارے بیٹھے ہیں خدا کے واسطے اس چیمبر کی طرف ضرور دیکھیں۔ یہ لڑکیاں بے خیالی میں کوئی باتیں کر جائیں اب یہ بڑی ہوں گی نا، تو ان کی شادیاں ہونی ہیں تو انہوں نے

اپنی وہ کیا ہوتی ہیں نندیں، اور ساسیں ان کے خلاف کیا کیا کچھ باتیں کر دیتی ہیں۔ پہلے تو چھپ کر کرتی تھیں، اب تو سیدھے منہ پر ہی کر جاتی ہیں۔ تو پھر جو ظلم ہوتا ہے ان کی ذات پر بھی اور ان بے چاری بوڑھیوں پر بھی اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ پھر ہم نے دُعا مانگی کہ یا اللہ تو مہربانی فرما اور وہ بہت پیارا، اور خوب صورت بچہ تھا تو اس کو واپس لا دے پھر ہمارے بابا نے یہ کہا، یا اللہ آئندہ زندگی میں اس کو نمبر بھی زیادہ ملتے رہا کریں اگر یہی بات ہے کم بخت زندگی میں تو اس کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہم بہت غمناک ہوئے۔ آپ سے بھی میری یہی درخواست ہے کہ جب آپ الفاظ کا استعمال کریں تو دیکھیں یہ گولیاں ہیں جو آپ نے چیمبر میں ڈالی ہوئی ہیں اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں چلاتا ہے یا نہیں چلاتا ہے۔ ہمارے ملک میں خاص طور پر میں محسوس کر رہا ہوں، میرے پیارے ملک میں جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے لوگ جو ہیں وہ ایک دوسرے کا مان ادرش نہیں کر رہے ہیں، اور ان کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہو رہا کہ دوسرے لوگ جو ہیں ان کے اندر بھی جذبات ہیں وہ بھی کچھ ہیں۔ competition میں اور مسابقت اور مقابلے سے آپ کو روکا گیا ہے اور تقویٰ، نیکی، اچھائی کے لیے آپ کو ابھارا گیا ہے کہ ہاں یہاں پر جتنا ایک مقابلہ ایک دوسرے کا کر سکتے ہیں کرو۔ راز اس میں یہ ہے کہ تقویٰ میں، اچھائی میں نیکی میں جب آپ اپنے مدمخالف کے ساتھ مقابلہ کریں گے تو ہمیں نیچے ہو کر دیکھنا پڑے گا جوں جوں آپ نیچے ہوں گے جتنی آپ عاجزی کریں گے جتنا آپ جھکیں گے اتنے آپ تقویٰ میں اونچے ہوں گے نا۔ جتنا تکبر کریں گے جتنا اونچائی میں جائیں گے جتنا آپ شیخی بگھاریں گے جتنا آپ اپنے آپ کو اَنا عطا کریں گے، اتنا ہی آپ کا مسئلہ جو ہے وہ ایک مختلف ردھم اختیار کرتا چلا جائے گا۔ ہاں آپ ضرور competition کریں۔ میں competition سے منع نہیں کرتا، میرا دین competition سے منع نہیں کرتا، لیکن صرف تقویٰ کی حد تک لازم ہے اخلاقی زندگی بسر کرنے کی نیکی اختیار کریں۔

تقویٰ جس میں وہ competition ہو جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو وہ آپ کا طرۂ امتیاز نہیں ہونا چاہیے، کسی بھی صورت میں کسی بھی حال میں۔ آپ نے نام سنا ہو گا حضرت جنید بغدادی کا۔ سب سے بڑے ہمارے صوفی، اُن سے ابتدا ہوئی جس کو کہتے ہیں ٹمھ لگا لیکن وہ صوفی نہیں تھے وہ خلیفہ بغداد کے دربار میں ایک پہلوان تھے۔ ایک بہت بڑے ریسلر تھے جیسے آپ کے یہاں گاما پہلوان تھا۔ جنید بغدادی بھی مشہور تھے اتنے بڑے پہلوان کہ کوئی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن وہ دربار میں بیٹھے تھے اور خلیفہ بھی تھا وہاں ایک دبلا پتلا کمزور سا آدمی مریل سا فاقہ زدہ سے

کہنے لگا کہ اے خلیفہ میں جنید کے ساتھ آیا اور خلیفہ وقت سے چارہ شکل وصورت کا بہت پیارا اور بہت اچھا، کشتی لڑنا چاہتا ہوں۔ تو جتنے دربار میں لوگ بیٹھے تھے، ہنس پڑے۔ کہنے لگے کیا پدی کیا پدی کا شوربہ، تو شکل دیکھ اپنی اور اپنا وجود دیکھ اور تو اتنے بڑے پہلوان کے ساتھ کشتی کرے گا! اس نے کہا نہیں جناب مجھے کچھ داؤ ایسے آتے ہیں، کچھ چیزیں میں ایسی جانتا ہوں جو کہ اور پہلوان نہیں جانتے، اور ہمارے پاس کچھ خاندانی گر ہوتے ہیں نا وہ داؤ میں لگاؤں گا اور آپ کا جو اتنا بڑا نامی گرامی رستم زماں ہے یہ چاروں شانے چت ہو گا۔ حضرت جنید بھی یہ بات سن کر بہت حیران ہوئے اور تھوڑا سا گھبرائے بھی اللہ جانے ان کو کچھ ایسا راز آتا ہو گا، تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ چنانچہ وقت مقرر ہو گیا جگہ طے کر دی گئی اور خلیفہ وقت پر وہاں پہنچ گیا، سارے درباری اور بغداد کے سارے لوگ کہ یہ آج کیا ہونے لگا ہے وہ بھی خم ٹھونک کے یدہ کمزور، دبلا پتلا آدمی مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا، وہ بھی آ گیا میدان میں۔ اور اصل پہلوان جو تھے وہ بھی اپنا لنگر لنگوٹ کس کے آ گئے۔ تو اس نے ہاتھ بڑھایا انہوں نے ہاتھ پکڑا، سلام کیا۔ ایک دوسرے سے ملے سلامی لینا جسے کہتے ہیں اور جب حضرت جنید بغدادی کا مضبوط ہاتھ آگے بڑھا تو وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا پھر اس نے ایک چھلانگ لگائی۔ دبلا پتلا کمزور سا آدمی جو تھا وہ اُچھل کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ اب یہ تو کوئی داؤ نہیں ہے کہ آدمی اس کے گلے میں جب لٹک گیا تو ان کے کان کے پاس منہ کر کے کہنے لگا: ''میں سید زادہ ہوں اور سات دنوں سے بھوکا ہوں، میرے پاس روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں یہ ڈھونگ میں نے اس لیے رچایا ہے۔ اے جنید تا کہ میں لوگوں کو دکھا سکوں کہ میری کوئی عزت ہے۔'' جنید بغدادی نے یہ سنا اور زمین پر دھڑ کر کے گرے اور اس سے ڈھے گئے۔ وہ ان کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا، اور تالی بج گئی، دنیا حیران پریشان ہو گئی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے (جنید بغدادی) کہا کہ ٹھیک ہے اس کو ایسا داؤ آتا ہے جو دنیا میں کسی آدمی کو نہیں آتا اور اس کے سامنے چت ہو گیا ہوں، یہ واقعی طاقتور ہے۔ وہ تو جناب خلیفہ نے جو بھی کچھ انعامات اکرام خلعت وغیرہ دینی تھی دی اور حضرت جنید جو تولیہ یا جو صافہ گلے میں تھا جھاڑتے ہوئے کہہ رہے ہیں: ''اے اللہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی ایسا بڑا کام نہیں کیا، لیکن تیرے ایک بندے کی عزت رکھی ہے اس کے بدلے میں مجھے بھی تو کوئی روحانی درجہ عطا فرما، جو تو اپنے بڑوں کو دیا کرتا ہے۔'' تو وہ ولی کامل ہوئے اور ان کی جو تعلیم ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو کبھی بھی ذلیل، چھوٹا، حقیر نہیں جاننا۔ جوں جوں آپ ایسا جانیں گے آپ کے درجات کم ہوتے جائیں گے۔ جوں جوں آپ حضرت جنید بغدادی کا رویہ اختیار کریں گے، آپ کے درجات بلند ہوتے جائیں گے۔

ہم سے غلطی یہ ہوتی ہے، میں پھر چلتے ہوئے آخری بات کہوں، ہم سوچے سمجھے بغیر پہلے تو کچھ بات منہ سے نکال دیتے ہیں، اور پھر اپنے تکبر میں اضافہ کرنے کے لیے اس چیز کو طرۂ امتیاز بنا لیتے ہیں جو آپ کے کمال کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ بچوں کے نمبر آ جانا، آپ کا خوش شکل ہونا، آپ کا چہرہ اچھا ہونا، آپ کی رنگت گوری ہونا یہ محض عطائے خداوندی ہے۔ اس کو تم اپنی تلوار بنا کر لوگوں کی گردنیں نہ اُتارتے رہو، اور خدانخواستہ اگر ایسا وقت آ گیا کہ صرف آپ ہی کی ذات اس کرۂ ارض پر رہنے لگی تو آپ یا آپ کے بچے کو یہ زندگی گزارنی بڑ مشکل ہو جائے گی۔ خالی ساری ویران دنیا میں لوگوں کو آباد رہنے دیں ان کے ساتھ ہنسنے کھیلنے دو۔ ہم چلتے چلتے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ بچہ مل گیا تھا پھر وہ ہمارے ڈیرے پر بھی آیا۔ اور پھر جب تک اس نے میٹرک کیا، جب تک وہ آتا رہا اور پھر ہم سارے اس سے معافیاں مانگتے رہے اور اس میں، میں سب کو آپ کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں کہ جب بھی اس کی یاد آئے پتا نہیں وہ کہاں ہوگا، آپ بھی اس بات کی معافی مانگیں کہ اس کے باپ نے اُسے موٹو کیوں کہا تھا۔ یہ ایک بری بات ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

بلوچوں کا ڈیرہ

ہم اہل زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے کبھی اونٹ کی سواری کی ہے یا نہیں۔ پھر بھی ایک اندازے کے مطابق یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اونٹ دیکھا ضرور ہے۔ ہم نے اپنے بچپن میں اونٹ کی بہت سواری کی۔ اس لیے کہ ہمارے گھر کے قریب جس گاؤں میں میں رہتا تھا، وہاں بلوچوں کا ایک ڈیرہ تھا۔ بلوچ، اور اونٹ لازم وملزوم چیزیں ہیں، اور بلوچ لوگ بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں میری زندگی پران کا بڑا خوشگوار اثر ہے۔ وہ اس لیے کہ ایک مرتبہ میرے والد نے مجھے جھڑکا اور شاید ایک تھپڑ بھی مارا۔ میں منہ بسورتا ہوا اماں بلوچن کے گھر چلا گیا۔ تو اس نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ میں نے کہا، اباجی نے مارا ہے۔ وہ چادر لے کر غصے سے ہمارے گھر آگئی۔ اور کہنے لگی، ڈاکدار تو نے بچے کو کیوں مارا؟ کہنے لگے، میں نے اس کو مارا نہیں بلکہ جھڑکا۔ کہنے لگی جھڑکا بھی کیوں۔ وہ سمجھتی تھی کہ جھڑکا بھی اس قسم کی چیز ہے۔

اونٹ پر ہم بہت سواری کرتے رہے۔ پھر اس کے درمیان ایک بڑا لمبا وقفہ آ گیا، 1946ء میں جب پاکستان کی تحریک بڑے زوروں پر تھی تو ہمیں دریائے ستلج کے کنارے ایک لمبے سفر پہ تبلیغ کے لیے جانا تھا تا کہ پاکستان کی طرف لوگوں کا جھکاؤ پیدا کیا جا سکے۔ وہاں تقریباً کچھ ایسے لوگ تھے جن کا جھکاؤ پاکستان کی طرف بہت کم تھا اور وہ مسلم لیگ سے ناواقف تھے۔ ہمیں وہاں اونٹ پر جانا پڑا۔ ہمارے پاس دو اونٹ تھے۔ دونوں جوان علی گڑھ یونیورسٹی سے آئے تھے۔ یہ ایک لمبا سفر تھا ہم نے ایک دن میں ساٹھ میل کی مسافت اونٹ پر طے کی، پھر ہماری خوش قسمتی سے وہاں راستے میں دو ڈاکو مل گئے۔ ایک کا نام گامن تھا، ایک کا نام سجاول تھا۔ رنگ دار بندوقیں تھیں۔ انہوں نے ہمیں روک لیا تم کدھر جارہے ہو۔ ہم نے بتایا ہم ایک مشن پر جارہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہم ڈاکو ہیں ہمیں ایک کراڑ کو لوٹنے جانا ہے ہمیں اونٹ

دے دیں۔ ہم نے کہا، اونٹ ہمارے لیے بہت ضروری ہیں، تم کراڑ کو بعد میں لوٹ لینا ہمارا کام زیادہ ضروری ہے۔ انہوں نے کہا نہیں ہمارا کام تم سے زیادہ ضروری ہے۔ خیر وہ ایک لمبی کہانی ہے وہ پھر کبھی بعد میں سناؤں گا۔ پھر دونوں ڈاکو ہمارے دوست بن گئے اور اونٹ پر بیٹھنے کا طریقہ بتایا کہ اگر کاٹھی نہ بھی ہو تو پھر اونٹ کی کوہان پر لانگڑی مار کر بیٹھا جاتا ہے ہر ایک کام کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا تھا آپ سے کہ چند دن پہلے کراچی جانے کا اتفاق ہوا، میں تقریباً آدھی صدی کے بعد سن پینتالیس کے بعد پاکستان کی سرحد کے اندر اونٹ پر بیٹھا۔ کلفٹن میں آپ نے دیکھا ہوگا، اور ہم نے بھی اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کیا۔ اونٹ پر بیٹھنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اونٹ اٹھنے کے انداز میں دوسرے جانوروں سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنی پچھلی ٹانگیں کھڑی کرتا ہے دنیا کے دوسرے سارے جانور اگلی ٹانگیں پہلے کھڑی کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے، اس کے اوپر بیٹھنے والا سب سے پہلے سجدہ کرتا ہے یہ اللہ نے اس کا ایک کام رکھا ہے۔ آدمی چاہے یا نہ چاہے سجدہ خود بخود ہو جاتا ہے پھر وہ اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا ہے ہم نے کافی وقت ان اونٹوں کے ساتھ گزارا، لیکن میرے ساتھ عجیب وغریب واقعات گزرتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ اس اونٹ کے رشتے سے، اور اس کے حوالے سے بھی میں یوں ایک الجھن میں بھی گرفتار ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ اونٹ کے بارے میں بھی قرآن پاک میں کہتا ہے کیا تم نے اونٹ کو دیکھا کہ کس طرح کا جانور بنایا۔ یعنی اس کے عجائب وغرائب ابھی تک پوشیدہ ہیں، اور سارے کے سارے اس کے خصائص لوگوں کے سامنے نہیں آئے، اتنا ہم جانتے ہیں یہ میلوں اور دنوں تک سفر کر سکتا ہے پانی کے بغیر۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف نظریات ہیں لیکن یہ اپنے انداز کا بڑا ہی خوب صورت جانور ہے۔ بے حد خوب صورت۔ اگر آپ نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا، اب آپ کو موقع ملے تو اسے ضرور دیکھیے گا۔ اللہ کرے آپ جائیں یا آپ گئے ہوں گے، جدے سے مدینے جاتے ہوئے بڑی خوب صورت سڑکیں ہیں، کبھی کبھی ریگستان کے لق ودق ٹوٹے اور کچے علاقے آجانے پر آپ کو چلتے پھرتے اونٹوں کی کچھ قطاریں نظر آئیں گی۔ ان کے مالکوں نے کھلے چھوڑے ہوتے ہیں چاندی جیسی ریت پر جیسے چاندی سے بدن لے کے دھوپ کے اندر ایک عجیب گل کھلاتے ہوئے چلتے ہیں وہ نظارہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ہم بس پر سفر کر رہے تھے اور بس سے سر نکال نکال کر بڑی دیر تک ان کو دیکھتے تھے، اللہ میاں نے کیسی خوب صورت مخلوق پیدا کی ہے۔ اس کے بارے میں ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ اسی سلسلے میں مجھے کچھ یاد آیا۔ پاکستان میں جب امریکہ کا صدر آیا، ابھی تک شاید ایک ہی آیا ہے، جس کا نام London B. Jhonson تھا۔ وہ کراچی اترا، تو جس چیز نے لنڈن بی جانسن کو متاثر کیا، وہ عجیب چیز اونٹ تھا۔ ہماری بہت گاڑیاں تھیں جو سامان، اسباب نقل وحرکت میں کام آتی تھیں، بہت سارا سامان

ڈھوتی تھیں۔ اونٹ گاڑیاں تھیں، یہ 1953,1952ء کی بات ہے وہ اونٹ سے اتنا متاثر ہوا تو اس نے کہا میں تو اونٹ امریکہ لے کر جاؤں گا، اور اس کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اونٹ کو تو نہیں لے جاسکا اس اونٹ کا ساربان جو کہ شتربان تھا بشیر اس کو ساتھ لے گیا، اور بشیر بچارے کو بڑی مصیبت پڑی، اور وہ روتا تھا کہ اونٹ کی وجہ سے مجھے امریکہ جانا پڑ رہا ہے۔ وہ امریکہ جانے سے گھبراتا تھا کہ مجھے وہاں کی بولی نہیں آتی۔ اخبار میں بیان دیا، میں وہاں جا کر کیا بات کروں گا، امریکہ جا کر مجھے کیا لینا ہے۔ مجھے اونٹ گاڑی چلانی ہے، الغرض اس کو جانا پڑا۔ اس نے نئی رومی ٹوپی خریدی۔ اگر آپ نے تصویریں دیکھی ہوں تو بے چارے نے یہ کچھ کیا، وہ آزاد آدمی تھا۔

پچھلے دنوں میں اونٹ کے بہت قریب رہا۔ مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا، اونٹ کے جسمانی طور پر قریب رہ کے، اس عمر میں اس کی سواری کرنے کے بعد ایک اور انداز سے اونٹ میری زندگی کے میری روح کے اور میرے وجود کے، اور میری سائیکی کے قریب آجائے گا۔

میں آپ سے اونٹ کی باتیں کر رہا تھا تو میرے ذہن میں اس اونٹنی کا خیال بار بار آتا ہے جو اونٹنی حضرت صالحؑ کی اونٹنی تھی، اور جو ایک معجزے کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ قوم ثمود کی طرف صالحؑ کو اللہ نے بھیجا تھا، اور وہ بہت اونچے درجے کے نبی تھے انہیں حکم ہوا کہ جا کر اس بے ہودہ قوم کو راہ راست پر لاؤ۔ وہ بڑی بگڑی قوم تھی۔ بیشتر میں خرابی یہ تھی کہ ان کے پاس دولت بہت زیادہ تھی، علاقہ بہت سرسبز تھا۔ اُردن کے علاقہ سے لے کر عرب تک اور مدینے شریف سے لے کر تبوک کے درمیانی علاقے میں وہاں جا کر ثمود کی جغرافیائی حد ختم ہوتی ہے۔ لمبا چوڑا علاقہ تھا اور ثمود کے لوگ اپنے تئیں تکبر کے مارے ہوئے اور اپنے آپ کو بہت برتر سمجھتے ہوئے اونچے پہاڑوں کو تراش کر چھینی ہتھوڑی سے اسے چھیل چھیل کر ان پہاڑوں کے اندر نہایت خوبصورت محل بناتے تھے۔ یہ ان کا بڑا کمال تھا، یعنی انہوں نے کوئی لینٹر نہیں ڈالا کوئی اینٹ و پتھر جمع نہیں کیے، پہاڑ کو چھیلنا، کھرچنا شروع کر دیا، اور اس کے اندر ایسے اعلیٰ درجے کے کمرے بنائے، ستون محرابیں بنائی ہیں کہ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابھی اگر آپ چاہیں تو اُردن کے علاقے میں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ سلائیڈیں بھی ملتی ہیں۔ اگر آپ کو جغرافیے کا شوق ہے تو جیوگرافک میگزین میں گاہے بگاہے ان محلات کی وہ تصویریں فوٹو گراف کی صورت میں، اور ڈرائینگ کی صورت میں آتی رہتی ہیں۔ تو وہ لوگ بڑے معتبر لوگ تھے، اور وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے، تب اللہ نے ایک پاکیزہ نبی حضرت صالحؑ کو ان کے پاس بھیجا کہ جا کر ان کو اللہ کا پیغام دیں تو ان لوگوں کو نبیوں کے اوپر جو اعتراض رہا تھا، جتنے بھی نبی ان کے پاس بھیجے گئے ہیں، ایک ہی اعتراض رہا ہے کہ آپ کیسے نبی ہو سکتے

ہو؟ آپ ہمارے جیسے انسان ہو۔ اور کہتے تھے کہ تو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اور پھر تیسری بات کہ تو غریب آدمی ہے اور غریب آدمی کیسے نبی ہو سکتا ہے؟ نبی تو بہت امیر آدمی کو ہونا چاہیے۔ متکبر کو ہونا چاہیے۔ فرعون نے بھی یہی کہا تھا کہ تم کیسے نبی ہو سکتے ہو، تیرے بازوؤں میں سونے کے کنگن بھی نہیں۔ اور بھی جتنے پیغمبر تھے ان کے ساتھ بھی یہی تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ بھی۔ وہ یہی بات بار بار دہراتے کہ اگر تو سر بلند ہوتا اور تیرے بھی اتنے اونچے محل ہوتے جتنے لوگوں کے پاس ہیں تم نے بھی ایسی عمارتیں بنائی ہوتیں، اے صالحؑ تو ہم تم کو پیغمبر مان لیتے لیکن اب تو تُو ایک عام آدمی ہے۔ ٹھیک ہے بھلے آدمی ہو لیکن تمہاری اقتصادی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھیں ہم بھی بار بار Acknowledged Condition کی بات کرتے ہیں۔ جب بھی کبھی مصیبت پڑتی ہے بوجھ پڑتا ہے تو آپ بجائے اس بوجھ کو بلاواسطہ طور پر Directly برداشت کرنے کے لیے ہمیشہ پلٹ کر اکنامکس کی طرف جاتے ہیں۔ ہماری اکنامکس کمزور ہے اس لیے کام نہیں کرتے۔ ہم نیک اس لیے نہیں ہو سکتے کہ ہم مالی طور پر کمزور ہیں۔ ہم بہادر اس لیے نہیں ہو سکتے کہ ہم مالی طور پر کمزر ہیں۔ اچھے انسان اس لیے نہیں بن سکتے کہ مالی طور پر کمزور ہیں۔ تو وہ بھی یہ کہتے تھے کہ تم مالی طور پر بہت کمزور ہو۔ تمہارے پاس اتنے بڑے محل ہوتے جتنے ہمارے پاس ہیں، پھر ہم نبی مانتے۔ لیکن وہ کہتے مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں تم کو بھلائی کے راستے کی طرف بلاتا ہوں تمہارا اس میں فائدہ ہے۔ میں تم سے اس کے عوض کوئی ٹیوشن فیس نہیں مانگتا جو کچھ ہے میں مفت میں دیتا ہوں اور میرا اجر اللہ کے پاس ہے۔ تو انہوں نے کہا ہم تجھ کو پیغمبر نہیں مانتے، اگر ہم طبیعت پر بوجھ ڈال کر آپ کو پیغمبر مان بھی لیں، تو اس کے لیے ایک شرط ہے کہ ہمیں کوئی معجزہ دکھاؤ ثمود قوم نے کہا۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا، آؤ تم کونسا معجزہ چاہتے ہو، لیکن انہوں نے Warn کیا کہ معجزہ رونما ہو چکنے کے بعد پھر اگر تم نے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو نہ مانا تو پھر تم پر عذاب آ جائے گا۔ خوش نصیب ہیں وہ قومیں، جنہوں نے معجزہ طلب نہیں کیا، لڑائی جھگڑا کرتے رہے ہیں، لیکن معجزہ نہیں مانگا، وہ بچ گئے لیکن اگر معجزہ مانگ لیا جائے اور معجزہ طلب کر لیا جائے اور وہ رونما ہو جائے پھر بھی نہ مانا جائے تو پھر عذاب طے شدہ بات ہے۔ انہوں نے کہا کوئی بات نہیں ہم برداشت کر لیں گے لیکن اگر تو معجزہ رونما کرے گا تو۔ دیکھیے ان ظالموں نے معجزہ طلب کیا۔ انہوں نے کہا، ہم یہ چاہتے ہیں سامنے چٹیل پہاڑ ہے اور بہت چکنا و مضبوط ہے کروڑوں سال سے اپنی جگہ پر قائم ہے ہم یہ چاہتے ہیں تیرا اللہ اس پہاڑ سے ایک اونٹنی پیدا کرے۔ اب پہاڑ کا اور اونٹ کا کوئی تعلق نہیں اور وہ اونٹنی آئے ہمارے ساتھ ہماری بستی میں رہے تو پھر ہم مانیں گے کہ تم پیغمبر ہو۔

چنانچہ انہوں نے دُعا کی، اور اللہ سے اس معجزے کو طلب کیا کہ اگر یہ لوگ اس طرح سے ہی مان

جائیں تو ان کا فائدہ ہے۔ ان چٹیل چکنے پہاڑوں کے درمیان میں سے اللہ کے حکم سے اونٹنی نمودار ہوئی۔ اور ان کے آگے چلتی آ رہی ہے۔ پہاڑوں کا قد بت بھی بہت بلند تھا، وہ اونٹنی بھی چاندی کا ایک مرقع نظر آتی تھی، چلتی ہوئی آ گئی اور بستی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور ظاہر ہے ادھر اُدھر دیکھنے لگی ہو گی وہاں آ کے۔ ان لوگوں نے اسے دیکھا اور حیران و ششدر بھی ہوئے کہ اونٹنی تو پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اب ہم اس کو کیا کریں۔ تو حضرت صالح نے فرمایا تمہاری خواہش کے مطابق تمہاری آرزو کے مطابق یہ اونٹنی انہی پہاڑوں کے درمیان میں پیدا ہو کر آپ کے درمیان آ گئی ہے۔ اور اب یہ آپ کی مہمان ہے۔ اب اللہ نے ایک شرط عائد کی ہے کہ بستی کے ایک کنویں سے یہ پانی پئے گی، اور اس کا ایک دن مقرر ہو گا اس دن وہاں سے کوئی دوسرا آدمی پانی نہیں لے سکے گا۔ نہ مویشی نہ چرند پرند نہ انسان۔ اونٹنی ہماری معزز ترین مہمان ہے اس کی دیکھ بھال کرنا ہمارا فرض ہے۔ انہوں نے کہا بہت اچھا ہم ایسا ہی کریں گے۔ کچھ دن تو انہوں نے اونٹنی کو برداشت کیا، اور باری کے مطابق جو دن مقرر تھا اسے پانی دیتے رہے لیکن پھر انسان انسان ہے ان میں ایک آدمی ایسا پیدا ہوا جس نے مزید آٹھ آدمیوں کو ورغلایا اور وہ نو ہو گئے۔ انہوں نے کہا یہ کیا شرط ہم نے اپنے آپ پر عائد کر لی ہے اور اس اونٹنی کی کیا حیثیت ہے ہم اس کا کسی نہ کسی طرح سے قلع قمع کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے رات کے وقت اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، جو کہ ٹخنوں کے اوپر کا حصہ ہوتا ہے۔ تو اونٹنی ظاہر ہے وہاں پر اپاہج ہو کر بیٹھ گئی۔ صبح کو جب سب لوگ بیدار ہوئے، اور اونٹنی کے پانی پینے کی باری تھی، لیکن وہ تشریف نہ لائی، کیونکہ وہ وہاں نہ تھی۔ جب حضرت صالحؑ کو علم ہوا کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ تو پھر انہوں نے اپنی قوم سے کہا، یہ بہت برا ہوا، نہ صرف تم نے اس معجزے کو جھٹلایا بلکہ اس مہمان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، اب تین دن کے اندر اندر تمہارا قلع قمع ہو جائے گا، اور تم نیست و نابود ہو جاؤ گے۔ پھر آنے والی تاریخ میں لوگ انگلیاں اٹھا کر بتایا کریں گے کہ یہ ثمود کے رہنے کی جگہ تھی، اور یہ اُن کے محل تھے جو ویران پڑے ہیں، اور قیامت تک اسی طرح ویران رہیں گے۔ چنانچہ جیسا فرمایا گیا تھا بالکل ویسے ہی ہوا پہلے دن جیسے کہ بتاتے ہیں کہ ان کے منہ پیلے ہوئے اگلے دن بے حد سرخ ہو گئے پھر کالے۔ پھر ایک ایسی چنگھاڑ، جیسے آج کل بم بنے ہیں، چنگھاڑ آئی، وہ سارے کے سارے اوندھے منہ گر گئے اور نیست و نابود ہو گئے۔

ایک دفعہ مجھے ایک دوست کے پوتے کی شادی پر اسلام آباد جانا ہوا تو اسلام آباد پہنچ کر مجھے ایک پیغام ملا کہ ایک بابا ہیں جو آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بابوں کا بڑا دیوانہ ہوں آپ کو علم ہے۔ پچھلے ہفتے آپ سے بابا کی بات کر رہا تھا، جو ہمارے ساتھ اسی ٹی وی سٹیشن کا رہنے والا تھا۔ لیکن بابوں کے زائچے بابوں کی شکل و صورت، اور ان کے ڈھانچے ان کے حلیے ان کے مزاج بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی مجھ سے یہ

آ کر نہ پوچھیں، ہر بابا بیٹھا بابا نہیں ہوتا میرے سائیں فضل شاہ صاحب جیسا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں ان سے ملنے ان کے پاس گیا۔ دھوپ تھی پہاڑی علاقہ تھا۔ میرے گلے میں چھوٹا سا صافہ تھا۔ آپ کو پتا ہے پہاڑوں کی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔ جب میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے: ''تم بڑی مٹھار مٹھار کے باتیں بناتے ہو اور باتیں سناتے ہو میں تم کو Warn کرتا ہوں'' یہ لفظ انہوں نے استعمال کیا Warn کرنے کے لیے بلایا ہے۔ یہاں پر تم لوگ بہت بے خیال ہو گئے ہو اور تم لوگوں نے توجہ دینا چھوڑ دی ہے اور تم ایک بہت خوفناک منزل کی طرف رجوع کر رہے ہو۔ دیکھو! کہنے لگے میں تم کو بتاتا ہوں یہ پاکستان ملک ایک معجزہ ہے۔ یہ جغرافیائی حقیقت نہیں ہے۔ تم بار بار کہا کرتے ہو ہم نے یہ کیا پھر یہ کیا پھر سیاست کے میدان میں یہ کیا پھر اپنے قائد کے پیچھے چلے ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ایسے مت کہو۔ پاکستان کا وجود میں آنا ایک معجزہ تھا اتنا بڑا معجزہ ہے جتنا بڑا قوم ثمود کے لیے اونٹنی کے پیدا ہونے کا تھا۔ اگر تم اس پاکستان کو حضرت صالحؑ کی اونٹنی سمجھنا چھوڑ دو گے نہ تم رہو گے نہ تمہاری یادیں رہیں گی۔ میرے گلے میں موجود صافے کو پکڑ کر کھینچ رہے تھے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میری کیا کیفیت ہو گی۔ انہوں نے کہا تم نے صالحؑ کی اس اونٹنی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا 52 برس گزر گئے تم نے اس کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا ہوا ہے جو ثمود نے کیا تھا۔ اندر کے رہنے والوں اور باہر کے رہنے والوں، دونوں کو Warn کرتا ہوں تم سنبھل جاؤ ورنہ وقت بہت کم ہے اس اونٹنی سے جو تم نے چھینا ہے اور جو کچھ لوٹا ہے اندر کے رہنے والو اس کو لوٹاؤ، اور اس کو دو اور باہر کے رہنے والو ساؤتھ ایشیا میں سارے ملکوں کو Warn کرتا ہوں اس کو کوئی عام چھوٹا سا معمولی سا جغرافیائی ملک سمجھنا چھوڑ دیں۔ یہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی ہے ہم سب پر اس کا ادب اور احترام واجب ہے۔ اس کو ایک معمولی ملک نہ سمجھنا اور اس کی طرف رخ کر کے کھڑے رہنا، اور اب تک جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کی معافی مانگتے رہو اور اس کو Recompensate کرو۔

میں اُن کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا، اور خوف زدہ ہو کے کھڑا رہا، اور پھر ان کو سلام کر کے، سر جھکا کے واپس چلا آیا۔ میری دُعا ہے، اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

☆☆☆

مَیں، نور جہاں اور 1965ء کی جنگ

اشفاق احمد کی زبانی

1965ء کی جنگ جب شروع ہوئی تو میں لاہور ہی میں تھا۔ دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان دنوں میں ریڈیو میں تھا کہ اچانک ایک پٹاخہ سا چلنے کی آواز آئی۔ ایک جہاز ہوتا ہے۔ 104 جب وہ سائڈ بیریئر کراس کرتا ہے تو زوردار آواز آتی ہے ہم بڑے ڈرے۔ ان دنوں حالات ویسے بھی اچھے نہ تھے۔ بہت تناؤ تھا۔ اعوان شریف پہ انڈیا نے بمباری کی تھی۔ کشمیر میں بھی جھڑپیں ہو رہی تھیں ۔۔۔۔ اسی دوران انڈیا نے انٹرنیشنل بارڈر کراس کر کے لاہور پر حملہ کر دیا۔ جب میں دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلا تو لوگوں کو پریشان دیکھا اور وہ گڈمڈائے ہوئے نہ تھے، سوچ کے سائے تھے جو ان کے چہروں پہ رقصاں تھے۔ کیمپس والی نہر پہ مجھے ایک گروہ ملا۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور ڈنڈے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ انڈیا نے حملہ کر دیا ہے ہم لڑنے جا رہے ہیں۔ وہ سارے ان پڑھ لوگ تھے۔ انہیں تو باریکیوں کا علم نہیں ہوتا۔ بس یہی کافی ہے کہ دشمن نے ہمارے گھر پر حملہ کیا ہے۔ دفتر آیا تو پتہ چلا گھمسان کی لڑائی شروع ہو چکی ہے۔

پاکستان کے بارے میں بہت متعصب آدمی ہوں۔ برداشت نہیں ہو سکا۔ بہت ایجی ٹیٹ ہوا۔ بہت غصہ آیا۔ ریڈیو پہ اس وقت ترانے وغیرہ ریکارڈ ہو رہے تھے۔ ان دنوں میرا ایک ہفتہ وار پروگرام چلتا تھا "حسرتِ تعمیر" لوگوں نے کہا یہ ذرا مشکل نام ہے۔ پھر تلقین شاہ نام رکھا۔ اب پروگرام روز ہونے لگا۔ وہ لوگ جو نہیں سنتے تھے وہ بھی سننے لگے۔ ایک عجیب سا رابطہ پیدا ہوا۔ مورچہ میں لڑنے والے سپاہی کے ساتھ بھی اور بارڈر کے پار دشمن کے سپاہیوں کے ساتھ بھی ان کے لوگوں سے اور خود ان کی حکومت کے

ساتھ ۔ایک تو ہمارے ترانوں کا سلسلہ تھا جو دل کو بڑا گرماتے تھے ۔اس میں میڈم کا ترانہ بہت مشہور تھا۔ یہ ریڈیو پہ آ گئیں اور وہیں رہیں ۔ادھر ہی دھنیں بنتی ،سکرپٹ لکھے جاتے ۔صوفی تبسم صاحب کی نظم پہ دھن تیار کی ''اے پتر ھٹاں تے نئیں وکدے'' میڈم کو یہ دھن بہت پسند آئی وہ فوراً ریکارڈنگ کے لیے تیار ہو گئیں ۔اتنے میں بڑا خوفناک سائرن بجا سب لوگ بھاگ کر ریڈیو سٹیشن بڑ کے درخت کے نیچے بنے مورچے میں گھس گئے ۔میڈم وہیں بیٹھی رہیں ۔میں نے کہا میڈم چلیں ۔وہ اس مستی اور وارفتگی میں بیٹھی تھی کہنے لگی ۔سٹوڈیو کی موت ٹرنچ کی موت سے بہتر ہوتی ہے ۔'' میڈم ملک کے معاملے میں بہت جنونی اور دیوانی ہیں ۔آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں کہ ایک بار جب یہ بمبئی گئیں تو لوگوں نے بے پناہ اپنائیت سے استقبال کیا تو وہاں میڈم نے ایک بہت خوبصورت بیان دیا کہ اتنے لوگ جو میری سواگت اور استقبال کے لیے آئے ہیں تو یہ عزت مجھے میرے ملک کی وجہ سے ملی ہے ۔

فرض کیجئے میں یہاں بمبئی کی گلوکارہ ہوتی اور ادھر ہی رہتی تو پھر میری یہ آؤ بھگت نہ ہوتی ۔یہ سب کچھ میرے ملک کی وجہ سے ہے ۔ساری عزت اسی کی وجہ سے ہے ۔ہمارے ریڈیو کے محاذ پر لڑنے والے ایک اعجاز بٹالوی تھے ۔یہ ہر روز 5 منٹ کی ایک تقریر نشر کرتے تھے ۔ایک اور تھے راجہ صاحب ۔الطاف گوہر کے چھوٹے بھائی ۔وہ لاہور میں تھے وہ بھی آ گئے کہ میں حاضر ہوں ۔وہ آج کا دن لکھتے تھے ان کو ایسا چسکا پڑا کہ محاذوں پر آگے جانے لگے اور آنکھوں دیکھا حال بتاتے ۔

یہ جو محاذ ہوتا ہے نا اللہ کبھی موقع دے اور آپ وہاں جائیں تو وہاں خوف نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ۔ جو شہروں میں یا گھر میں ہوتی ہے ۔وہاں چونکہ موت Expose ہوتی ہے جسے شیخ سعدی نے لکھا تھا کہ جب پانی میں چھلانگ لگا دی جائے تو پھر ڈوبنے کا ،رہنے کا اور جینے کا تو تعلق تو پانی سے ہی بن جاتا ہے ۔ پھر ساری سوچ فکر اور خوف کے عمل کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ہم جلو ۔بی آر بی اور دوسرے محاذوں پر گئے ۔ ہماری فوج نے بہت دلیری سے لڑ کر ان محاذوں کو بچایا تھا ۔ہندو بہت پریشان تھا اور حیران تھا کہ یہ ایک چھوٹا سا پدا سا ملک کس قدر مزاحمت کر رہا ہے ۔اسے اب بھی یہی خوف رہتا ہے ۔اب بھی اس کے سارے اخبار اور رسالے پاکستان کے حوالے سے ہی زندہ ہیں ۔ان کی زندگی سے پاکستان کا حوالہ نکال لیں تو بالکل ہی جوتیوں میں دال بٹنے لگے گی ۔ہمارا خوف کم ہو گا تو اس کی یک جہتی متاثر ہو گی ۔یہ اللہ کی حکمت ہے ۔اس کی باتیں ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں اور نہ آنی ہی چاہئیں کیونکہ ان کا لطف ہی یہ ہے اس کا کرم کئی روپ رکھتا ہے ۔ہندوستان اپنے دوسرے ہمسایہ ملکوں سے تو نہ صرف ڈرتا نہیں ہے بلکہ ان کو ہضم کرتا جا رہا

ہے۔ بھوٹان۔ سکم اور اب سری لنکا کی طرف مگر ہمارا خوف ان کے سانسوں کا حصہ اللہ نے بنا ڈالا ہے۔

ملک سے بے پناہ محبت کے بارے اشفاق احمد کہتے ہیں۔

"دیکھئے محبت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ یہ تو ہو جایا کرتی ہے۔ کسی ماں سے پوچھیں کہ بچہ بڑا کالا ہے بھینگا ہے کیا وجہ ہے کہ محبت کرتی ہو۔"

آج کل ہماری مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ ٹی وی آ گیا۔ وی سی آر آ گیا۔ محبت کم نہیں ہوتی نہ ہو سکتی ہے۔ میں انڈیا کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ یہ وہ ترازو ہے جس میں ہم اپنی ہر چیز جانچ لیتے ہیں۔ جس دن اس کا ہوا کم ہونے لگا۔ آپ سمجھیں قیمت کم ہونے لگی۔ آپ لوگ بے شک ہمارے بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ لیکن یقین رکھیں یہ محبت کم نہیں ہوئی۔

یہاں تمام چیزوں کے باوجود ینگر جنریشن میں ایک لڑکا لڑکی بھی ایسا نہیں ملے گا۔ جو جی ایم سید جیسی بات کرتا ہو۔ اُسے پسند کرتا ہو۔ وہ جو دوسرا ہے بابا غفار خان تو اس کا بھی نام سن کر سب غصے میں آ جاتے ہیں۔ پاکستان میں جو مسائل انہیں۔۔۔ درپیش ہوئے ہیں۔ غصہ تو کبھی ضرور آ جاتا ہے۔ جیسے والد پر آ جاتا ہے کہ دس روپے دیے ہیں زیادہ کیوں نہیں۔

میری نگاہ اتنی کوتاہ نہیں ہے کہ میں اپنی سوچ میں صرف قریب ہی کی نہیں الحمد اللہ بہت دور کی چیزوں کو بھی دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔ میرے ہاں اس قسم کی مایوسی بالکل نہیں ہے جیسی کہ دفتروں میں یا اخباروں میں ہوتی ہیں کہ یہ ہو گیا وہ ہو گیا۔ اس کی وجہ ہے۔

○

کانٹے سے کھوٹے تک کا سفر

1947ء میں مَیں ایم اے میں پڑھتا تھا۔ پاکستان بن گیا تو یقین کریں ہمارے پاس کاغذ جوڑنے کو پنیں تک نہ تھیں۔ کیکر کے کانٹے ہوتے تھے جنہیں جمع کر کے رکھتے تھے اور کاغذوں پہ، فائلوں پہ کانٹے استعمال ہوتے تھے۔ سارے ملک میں کل دو ٹیکسٹائل ملیں تھیں۔ باقی صنعتوں کا بھی یہی حال تھا۔ دفتروں میں یہی ہے نا؟ اب ہم نے پچھلے چالیس برس میں کانٹے سے کھوٹے تک کا سفر کیا ہے۔ کچھ کیا ہے۔ اب فرض کریں کھوٹے میں کچھ بھی نہیں ایک آئس کریم جمانے والی مشین ہی سہی مگر دنیا کا ہر ملک چاہتا ہے کہ ایک "جھاتی" لگا لینے دو۔ کچھ کیا ہے۔ تو یہ کانٹے سے کھوٹے تک کا سفر ہم نے اپنی تمام تر خامیوں کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود کیا ہے۔ پاکستانی قوم کے لیے ایک بہت ضروری بات ہے کہ

اس کا دشمن اس کو کوئی طعنہ دیتا رہے۔ پھر وہ طعنہ اس کے دل میں گڑ جاتا ہے۔ اس کے لاشعور کا حصہ بن جاتا ہے ہر وہ اس طعنے کے خلاف لڑ کے دکھاتا ہے۔

پاکستان بنتے وقت اس نے ہمیں طعنہ دیا کہ تم پاکستان بنا تو لو گے مگر چھ دن چلا کے تو دکھاؤ۔ بڑے کارٹون چھپتے تھے۔ ٹریبون تھا۔ ہندوستان ٹائم تھا۔ سٹیس مین تھا کہ تم ایک ٹھوٹھا لے لو اور مانگنے چل پڑو۔ پیسہ نہیں ہوگا تمہارے پاس۔ اب وہ بات پاکستانیوں کے دماغ میں گھس گئی پچھلے چالیس برس سے پاکستانیوں نے پیسہ کمانے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں کیا۔ صحیح طریقے سے جائز ناجائز ملک میں رہ کر باہر جا کر۔ دوبئ کے دھکے کھا کر ناروے تک جا پہنچے۔ کچھ کام نہیں کیا انہوں نے نہ گھر کا نہ دین کا، نہ تربیت کا نہ اخلاق کا، پیسہ کما کے دکھا دیا۔ رچ ہو۔ اب ہم ان کو بلا بلا کے اپنے بنکوں کی شاخیں دکھا گئے ہیں۔ پیسہ دکھاتے ہیں اور وہ منہ میں انگلی ڈال کے کہتے ہیں کہ پیسہ کمانے میں تو یہودیوں سے بھی آگے بڑھ گئے ہو۔ اب وہ ایک نیا طعنہ آنے لگا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ آئے۔ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ بڑی دولت ہے تو کہتے ہیں کہ مصنوعی ہے۔ کہیں اِدھر اُدھر سے لیا ہے۔ ہمارے ہاں تو بڑی فیکٹریاں ہیں۔ یہ ہے۔ وہ ہے۔ اب ہم نے اس طعنے کو اون کرنا شروع کر دیا ہے۔ پہلے ہم نے فیکٹریاں کم لگائی تھیں جو کہ مستقبل کی شورٹی اور سیکورٹی ہوتی ہیں۔ اب طعنہ آ چکا ہے۔ جو لوگ ہندوستان سے آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تمہارا ٹھاٹھ باٹھ تو بڑا ہے۔ کاریں ہیں۔ آسائشیں ہیں مگر قرضوں کے مال سے۔ ذرا مین ٹین تو کر کے دکھاؤ۔ ہم کہتے ہیں۔ جس نے دیا ہے وہ مین ٹین بھی کروائے گا۔ اب ہماری قوم اس طعنے کے پیچھے لگ گئی ہے۔ ہمارے کمال کار کے سنٹروں کا لوہا دور دور تک پھیل رہا ہے۔ وزیر آباد۔ سیالکوٹ اور دوسرے۔

اب میری بڑی آرزو یہ ہے کہ ایک طعنہ ہمیں اور ملے، گھر سے یا باہر سے کہ تم نے ٹھیک ہے یہ بھی ترقی کر لی۔ وہ بھی کر لی لیکن اختلافی نہیں کی۔ بس جس دن یہ طعنہ مل گیا۔ بس پھر دیکھیں چالیس سال کیا یہ دس سال میں کمی پوری کر دکھائے گی۔ کیونکہ اس کے مزاج میں ہے۔ پھر یہ پھُس کر کے نہیں بیٹھے گی کچھ کر کے دکھائے گی۔

اللہ کی ذات بڑی بے نیاز ہے۔ اس طعنے کے ساتھ ہمیں ایک آدمی بھی ملے گا جیسے 1947ء میں قائداعظم مل گئے تھے اور ہم نے سب کچھ اپنا Fath قائداعظم کے پاس جمع کروا دیا کہ آپ جو کچھ کہیں گے۔ ہم وہی کریں گے۔ اس وقت حکمرانوں میں بھی ایسا کوئی لیڈر نہیں اور ان کے باہر سبحان اللہ کوئی نہیں۔ عوام میں بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ کوئی دن ایسا طلوع ہوگا کہ کسی جگہ سے میر پورے

پتوکی سے، گوٹھ سے۔۔۔ تھرپارکر سے کوہاٹ سے کوئی ایسا بندہ ضرور آئے گا اور پھر مثلاً وہ کہے کہ صبح پو بجے اٹھو تو گھر والوں کے جگانے پر نہیں رہے گا بلکہ اُٹھ جائے گا۔ پھر یہ عمل شروع ہو جائے گا۔ میرے پروگرام کرنے سے یا اخبار میں لکھنے سے یہ نہیں ہوگا۔ معاف کیجئے۔ یہ بات میرے اور آپ کے خلاف جاتی ہے مگر ابلاغ کا کیا ہے وہ تو ہو چکا ہے۔ پاکستان کے سب تھانیداروں کو علم ہے کہ رشوت نہیں لینی۔ یہ ابلاغ سندھی میں بھی ہے۔ پشتو میں بھی ہے مگر یہ ابلاغ پکڑاتا ایک آدمی ہی ہے جیسے ماں کو مان ہوتا ہے اور وہ کہتی ہے کہ اگر تُو نے فلاں کام نہ کیا تو میرا منہ دیکھنا تجھے نصیب نہ ہو۔ بیٹا کتنا، ہی پی ایچ ڈی کیوں نہ ہو۔ اس کی لاج رکھتا ہے۔

1965ء کے تلقین شاہ کے حوالے سے کچھ بتائیں!

ویسے مجھے زیادہ یاد نہیں ہے۔ بس بات چیت تھی کچھ اپنے لوگوں سے ہوتی تھی۔ اپنے سپاہیوں کا مورال بڑھانے کے لیے ہوتی تھیں۔ کچھ ان کو Let Down کرنے کے لیے ہوتی تھیں، ہندوستان کے لوگوں سے ایک شریفانہ بات ہوتی تھی۔ برا بھلا کہے بغیر کہ آپ اُصول کی بات کریں۔ ہم نے اتنا عرصہ اکٹھا رہنے کے بعد الگ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب آپ نے یہ کیا کیا۔ یہ تو طے ہو گیا تھا کہ جہاں پہ جس دین کے زیادہ لوگ رہتے ہیں وہ ان کا علاقہ ہے۔ یہ کیس آپ دیکھیں کہ زیادتی کس کی ہے۔ کس نے اُصول توڑا ہے تین چار منٹ کی ان سے بات چیت ہوئی تھی۔ باقی اپنے عوام سے بات ہوتی تھی کہ فوج نہیں لڑتی عوام لڑتے ہیں۔ ان کے جذبے اور محبت لڑتے ہیں۔ اگر آپ کے استقلال میں فرق آ گیا تو پھر حل نہیں ہے۔

مجھے کبھی دنیاوی مسئلہ پر کوئی تکلیف نہیں ہوئی لوگوں کی طرف سے تشکر اور محبت کی روشنی بہت ملی۔ بندے کو اور کیا چاہیے کہ وہ اپنے معاشرے میں محبت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور پہچانا جائے۔ اس زمانے میں ہر آدمی کو کمزور سے کمزور آدمی میں بھی ایک عجیب طرح کی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ اس میں ایک بڑا دخل ایوب خاں کی اس تقریر کا بھی تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ورد کرتے ہوئے دشمن کو کچل ڈالو۔ جب کبھی خبر آئی کہ کسی جگہ چھاتہ بردار فوج اترے گی تو لوگ رات بھر جاگ کر ان سے نمٹنے کے لیے تیار رہتے۔ مزے کی بات یہ کہ پولیس والے کہتے تھے کہ کوئی کیس نہیں آ رہا بلکہ پورے عرصے میں کوئی واردات نہیں ہوئی۔ اس قوم بیچاری میں کمی یہ ہے کہ راہنما سے محروم ہے۔ اس نے اعلان کیا ہوا ہے کہ ہم تو قوم ہیں اپنی آرائش میں لگے ہوئے ہیں۔ کوئی موزے تنگ آ جائے تو ہم اس کے پیچھے

ہیں۔ پھر یہ نہیں ہوگا کہ اونچے اونچے مکان ہوں گے۔

جتنے بھی دوسرے اسلامی ملک ہیں۔ ان سب کو خیر پاکستان سے ہی پڑے گی۔ وہ بیچارے منتظر ہیں۔ اس قوم کو بڑی دیر سے انتظار ہے کسی ڈیشنگ پرسنیلٹی کی۔ یہ تو اللہ کی بھی سنت ہے کہ احکام کے ساتھ نبی ضرور آتے ہیں۔

آرزو اس بات کی ہونی چاہیے کہ اس آدمی کا انتظار ضرور کیا جائے۔ ایسا نہ کریں کہ اس بیچارے کو اپنی بے وقوفی سے آتے ہی شہید کر دیں۔ جب تک وہ نہیں آتا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے آنے سے یہی خطہ ہر کسی کی رہنمائی کرے گا۔۔۔ ہم ساری چالاکیاں جان گئے ہیں۔ گر سیکھ گئے ہیں۔ یو این او میں ادھر کوئی بات ہوتی۔ ہمارے ٹائپ رائٹر بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ انڈیا اسی لیے ناراض ہے کہ تو ''پدا'' سا تو ملک ہے مگر ہماری دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ تم بھی سری لنکا کی طرح رہو۔ ہم کہتے ہیں کہ دب کر رہنا تو مسلمان کی نیچر میں ہی نہیں ہے۔ میں تو یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ راہنمائی کی جو نعمت ہمیں ملنے والی ہے۔ اس کے لیے جھولی ضرور تیار ہو، تاکہ جب وہ آئے تو جھولی موجود ہو۔ کہیں یہ نہ ہو ''میں تے کرتا ای لاہ کے رکھیا ہویا سی''۔

☆☆☆

ادب، صحافت، سیاست اور معاشرت پر

اشفاق احمد سے طویل گفتگو

اشفاق احمد کے ڈرامے ہوں، سفرنامہ ہو یا افسانے ہوں سب میں حیران کر دینے کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے وہ ملکی حالات، بین الاقوامی صورتحال اور معاشرتی طور اطوار سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں اور ہر صورتحال پر اپنا منفرد تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے تجزیے سے، ان کی فکر سے اور ان کے خیالات سے اختلافات تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے دلائل کے وزنی ہونے سے انکار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آیئے ان کی سوچ اور افکار سے آگاہی حاصل کریں۔

س ـــــ کسی معاشرے کے زوال کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہاں پر ادب نہیں پڑھا جاتا کیا پاکستان میں ادب بالکل ہی نہیں پڑھا جا رہا، آپ اس رائے سے متفق ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ دیکھیں جی! اس بارے میں کوئی رائے دینے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کیا آپ کے ہاں ایسا ادب پیدا ہو رہا ہے جو پڑھا جائے اور جب پڑھا جائے تو اس سے انسان کی کوئی ذہنی بالیدگی ہو سکے۔ یہ فیصلہ کرنا میرے لیے اور آپ کے لیے واقعی مشکل ہو جائے گا۔ جب آپ اپنے ادب کا اس کلاسیکی ادب سے تقابل کرتے ہیں جو کہ دوسرے ملکوں میں لوگوں کے دلوں میں بہت جاری و ساری رہا ہے۔ میں کوئی بہت دور کے ادب کی بات نہیں کر رہا کہ یونان کا ادب نہیں لے رہا، روما کا ادب نہیں لے رہا، قرطبہ کا ادب نہیں لے رہا میں تو ابھی کی بات کر رہا ہوں۔ اس تقابلی مطالعے میں آپ کو واضح ہوگا کہ غالباً ہمارے ہاں ایسا ادب پیدا نہیں ہو رہا جو لوگوں کی اور قارئین کی راہنمائی کر سکے۔ جو ان کو یہ بتا سکے یہ جو مایوسی کا عالم ہے اور یہ جو پریشانی ہے اس کی وجوہات یہ ہیں۔ شاعری میں بھی دکھوں کا ذکر تو ہے، مایوسی کا ذکر تو ہے، تکلیفوں کا ذکر تو ہے، انفرادی تکالیف سے لے کر اجتماعی تکالیف تک سب کا ذکر ہے لیکن یہ کہ

اس کے لیے کیا کیا جائے۔ مثال کے طور پر ادب کئی جگہ چلتے چلتے یہ کہتا ہے کہ لوگ روٹی مانگتے ہیں اور اس کے بدلے میں ان کو احتجاج کی تعلیم دی جاتی ہے، بلوے سکھائے جاتے ہیں، سڑکوں پر لایا جاتا ہے، نعرے مارے جاتے ہیں، وہ تو یہ چیزیں نہیں روٹی مانگتے ہیں۔ آپ سے مثلاً کوئی پانی کا گلاس مانگے اور آپ کہیں کہ یہ پستول لے لو اور جا کر سڑک پر کھڑے ہو جاؤ اور جس کے پاس پانی ہے اس کو مارو۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ آپ اس سے کہیں کہ میرے پاس ایک کٹورا پانی ہے تھوڑا سا آپ پی لیں یا نہ پئیں یا میں آپ کو نہیں روک سکتا تو ادب کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ رہنمائی اور گائیڈنس مہیا کرے اور آپ پھر آگے چل کر اس سے استفادہ کریں یا نہ کریں یہ قارئین پر منحصر ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ لوگ پہلے کے مقابلے میں ادب زیادہ پڑھنے لگے ہیں۔

س ـــــ یہ تو آپ حیران کن بات کر رہے ہیں کہ پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ لوگ ادب پڑھنے لگے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ جی بہت، بہت زیادہ پڑھنے لگے ہیں۔

س ـــــ اچھی سے اچھی کتاب تو پانچ سو سے زیادہ بکتی نہیں پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ادب زیادہ پڑھا جا رہا ہے؟

اشفاق احمد ـــــ کتاب نہ بکے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں عرض کرتا ہوں۔ ادب کی طرف رجوع کرنے کی چند وجوہات ہیں جن کو میں بنظر غائب دیکھتا رہتا ہوں۔ ہمارے ہاں بہت سے ڈائجسٹ قسم کے رسالے چھپتے ہیں اور وہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور وہ پڑھے جاتے ہیں اگر ادب میں دلچسپی نہ ہو تو وہ نہ ہی چھپیں اور نہ ہی پڑھے جائیں۔ ان ڈائجسٹوں نے اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ پڑھنے کے لیے مواد مہیا کیا ہے۔ یہ کیسا مواد ہے؟ میں یہ بات نہیں کرتا لیکن بہرحال پڑھنے کے لیے مواد مہیا کیا اور گھر کی خاتون خانہ بھی جو کچن کی نگہداشت کرتی ہے وہ بھی پڑھنے لگی اور میرے اندازے کے مطابق ہر سال ڈائجسٹ کے دو ہزار سے ساڑھے تین ہزار قاری لوٹ کر ادب کی طرف آتے ہیں کہ ہم دیکھیں کہ یہ اشفاق احمد کا نام سنا تھا، منٹو کا نام سنا تھا ان کو بھی تلاش کریں تو وہ ادب کی طرف آتے ہیں اور ان کی وجہ سے ادب کو بہت سارے قاری ملے۔ بالکل ٹھیک ہے کہ کتاب پانچ سو چھپتی ہے لیکن جو کتاب توجہ طلب ہے وہ پانچ سو نہیں چھپتی مثلاً یوسفی صاحب کی کتاب پانچ سو نہیں چھپتی، اشفاق احمد کی کتاب پانچ سو نہیں چھپتی، مستنصر حسین تارڑ کی کتابیں ہزار، ڈیڑھ ہزار یا دو ہزار نہیں چھپتیں یہ بہت زیادہ تعداد میں چھپتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا ادب واقعی بہت پڑھا جا رہا ہے۔ میں ردعمل کے طور پر آپ کو بتا سکتا ہوں کہ کہاں کہاں سے خط آتے ہیں اور لوگ کیسے کیسے سوال پوچھتے ہیں۔ مثلاً پرانے زمانے میں جب ہم نے لکھنا شروع کیا، دیر کی

بات ہے بیدی صاحب یہاں ہوتے تھے کرشن چندر، منٹو اور ہم نئے اور چھوٹے لکھنے والے تھے تو مشکل سے ایک ہزار کتاب چھاپ کر رکھ چھوڑتے تھے کہ بکی نہ بکی۔ اب یہ کیفیت ہے اگر آپ کی کتاب دو ہزار چھپتی ہے تو پانچ سو کا گاہک تو امریکہ اور کینیڈا میں ہے پہلے ہی پیکٹ بند کر کے وہاں چلے جاتے ہیں اور فارن ایکسچینج اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ دوسرے پانچ سو سے آٹھ سو تک برطانیہ میں ہیں آپ کے چاہنے والے بہت بیٹھے ہوئے ہیں تو لوگ چمٹ جاتے ہیں کہ جی اس بات کا مطلب بتائیے کہ آپ نے یہ کیوں لکھا تھا اس کا کیا مطلب ہے۔ ہمارے ہاں یہاں گھر کے اندر ایک اور طرح کی بے چینی ہے۔ اس میں، میں سمجھتا ہوں کہ صحافت کا بھی ہاتھ ہے۔ صبح اُٹھ کر جب اخبار پکڑتے ہیں تو کبھی اس میں کوئی مثبت رائے یا دلیل دی ہی نہیں، اس ملک میں یہاں لاہور کی آبادی 65 لاکھ سے زیادہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے مثبت واقعات بھی ہوتے ہیں لیکن صحافی چھانٹ چھانٹ کر نکال نکال کر ایسی خبریں دیں گے کہ جس سے آدمی کی سٹی گم ہو جائے۔

س ——— جناب اشفاق صاحب! صحافت معاشرے کا آئینہ ہوتی ہے اور آئینہ وہی بتاتا ہے جو معاشرے میں ہو رہا ہوتا ہے ہمیں اپنے عکس سے شرمانا نہیں چاہیے۔

اشفاق احمد ——— ہاں! لیکن بہت سے آئینے دھندلے بھی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کانی آنکھ سے دیکھنا پڑتا ہے کہ تھوڑی سی روشنی ہو اور موچنے سے ایک بال نکال لیں تو ہمارا تو آئینہ بہت دھندلا ہوا ہے یہ کبھی صحیح نہیں ہوا۔ میں آپ کو عرض کروں کہ میری بہن گلبرگ میں رہتی ہے اس کا خاوند انجینئر ہے اس کے ساتھ ایک واقعہ ہوا ہے کہ اُس کا شوہر ایک دن گھر آیا اور کہنے لگا کہ لو بھئی آج آزادی اور چھٹی ہے میں مچھلی پکڑنے جا رہا ہوں، میری بہن نے کہا آپ کو تو مچھلی پکڑنے کا فن ہی نہیں آتا تو کہنے لگا کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اس سے تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے تو میں بلو کی جا رہا ہوں تم بھی چلو تو اس نے کہا کہ میں کیسے جا سکتی ہوں مجھے تو بہت کام ہیں، اس کے شوہر نے کہا کہ اچھا پھر میں جا رہا ہوں جاتے ہوئے انہوں نے لیٹر باکس میں آپا صغراں کے نام خط چھوڑ دیا کہ آپ اچار ڈال دینا شام کو جب واپس آئے تو اچار ڈالا ہوا تھا اور گھر کی صفائی بھی کسی نے کر دی تھی اور ساتھ رقعہ لکھا ہوا تھا کہ میں فلاں جنرل کا بیٹ مین ہوں ادھر سے گزر رہا تھا میں اندر آیا تو دروازہ کھل گیا میں نے گھر کی صفائی کر دی ہے! اچار ڈال دیا ہے میں ہر اخبار کے دفتر میں گیا یہ ایک مثبت خبر ہے اسے بھی شائع کر دیں۔ آج کے دور میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو فی سبیل اللہ کام کر جاتے ہیں اور چوری بھی نہیں کرتے مگر کسی اخبار نے یہ خبر نہیں شائع کی۔

س ـــــ آپ جو مثال دے رہے ہیں ایسے کردار معاشرے میں نہیں اگر ہیں بھی تو بہت کم ہوں گے۔
اشفاق احمد ــــــ جی بے شک ایسے لوگ بہت کم ہیں لیکن کیا کسی نے کبھی ان کی نشاندہی کی۔ دیکھیں جی ایک بڑی گندی سی مثال ہے کہ سور جب گلستان میں داخل ہوتا ہے تو سیدھا روڑی (گندگی کے ڈھیر) پر جاتا ہے اور سارے خوبصورت پھل پھول اور پودے چھوڑتا جاتا ہے اور بلبل جب بھی جاتی ہے پھولوں پر جاتی ہے۔ تو بدقسمتی سے ہمیں تو تلاش ہی اسی روڑی (گندگی کے ڈھیر) کی ہوتی ہے صحافت نے بھی روڑی چھاننی ہوتی ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں لیکن یہ باتیں کہی جانی چاہئیں۔ مغرب میں ایسا نہیں ہے۔
س ـــــ اشفاق صاحب! روشن پہلو کی بات کرتے، کرتے ہم زوال تک آ پہنچے اصل بات تو یہ ہے کہ اپنی غلطیوں کی بات کی جائے۔ ہمارے تاریک پہلو کیا ہیں ان پر بات کی جائے۔ آپ کے رویئے سے تو کوئی تبدیلی آنے کا امکان ہے آپ ''سٹیٹس'' کو رکھنا چاہتے ہیں۔ دنیا بھر میں جہاں بھی تبدیلی آتی ہے لوگوں نے اپنی غلطیوں کو پہچانا اور ان کی اصلاح کی مایوسی سے ہی جہان نو پیدا ہوتا ہے۔
اشفاق احمد ــــــ ہرگز نہیں۔ مایوسی میں جہان نو تو نہیں ہوتا۔ مایوسی کے بعد تو لوگ سوچیں گے کہ جو اندھیرا پہلو بیان کیا گیا ہے اس سے بھی زیادہ مایوسی کی بات میں آپ کو بتاتا ہوں جب آپ اندھیرا ہی پھیلا رہے ہیں تو ہر طرف اندھیرا ہی ہوگا۔ آپ کا فرض بنتا ہے، کہ خدا کے واسطے، میں دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ اچھائی اور روشنی کی باتوں کو پھیلائیں جو آج سے ڈیڑھ مہینہ پہلے کی بات ہے کہ دنیا کے تمام اخبارات میں نیویارک ٹائمز کے حوالے سے ایک خبر چھپی تھی کہ نیویارک میں ایک پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور ایک بوڑھی عورت کو لے کر گیا جو اس کی ٹیکسی میں 30 ہزار ڈالر چھوڑ گئی۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور فیصل آباد کا رہنے والا ہے اور امریکہ میں طالب علم ہے۔ وہ اس مائی کو ڈھونڈتا رہا اور وہ رقم واپس کر دی۔ وہاں کے میئر نے اس سے کہا کہ ہم آپ کو انعام دینا چاہتے ہیں تو اس نوجوان نے کہا کہ مجھے کسی انعام کی ضرورت نہیں۔ پھر اس میئر نے اس نوجوان سے کہا کہ آپ جو چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس کی فیس حکومت ادا کرے گی۔ اس خبر کو بہت چھوٹا کر کے چھاپا گیا اگر میں ہوتا تو اس کو لیڈ سٹوری کے طور پر شائع کرتا اس کو اس لیے چھوٹا شائع کیا گیا کہ اس سے تو لوگوں میں خوشی پھیلے گی۔ میں اپنی بہن کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کی خبر بڑے بڑے اخبارات میں لے کر گیا لیکن انہوں نے کہا چھوڑیں اشفاق صاحب اندھیرا رخ دکھائیں گے تو لوگوں کا بہت بھلا ہوگا۔ یہ روشن پہلو کو چھوڑیں۔
س ـــــ آپ اپنی تحریروں اور ڈراموں میں ہمیشہ روشن پہلو دکھاتے ہیں آپ پاکستان کی خودداری اور

عزت نفس کی بات کرتے ہیں لیکن اس سے معاشرے میں کوئی تبدیلی آئی ؟ پاکستان تو معاشرتی حوالے سے بالکل نیچے کی طرف جا رہا ہے؟

اشفاق احمد ـــــــ پاکستان میں یہ فرق پڑا ہے کہ پاکستان میں 47ء میں کاغذات پر لگانے کے لیے پن نہیں تھی ہم لوگ کیکر کا کانٹا لگاتے تھے۔ میں ایم اے میں پڑھتا تھا اور پیپروں پر بھی وہی کانٹا لگاتے تھے۔ آپ 49ء، 50ء کی فائلیں نکال کر دیکھ لیں۔ سیکرٹریٹ میں سب فائلوں پر کانٹے ہی لگے ہوئے ہیں اور کچھ تھا ہی نہیں، اس 50 سال کی مدت میں ہم کانٹے سے کھوٹے تک پہنچے ہیں، آپ بڑی زبردست قوم ہیں۔ کوئی مسلمان ملک ایٹم بم نہیں بنا سکا لیکن کیونکہ آپ نے لوگوں کو آپس میں محبت پر مجبور نہیں کیا ان کو عزت نفس نہیں لوٹائی تو یہ ہی دنیا کی وہ واحد نیوکلیئر پاور ہے جو خوف سے کانپ رہی ہے۔ کبھی سنا ہے کہ کوئی نیوکلیئر پاور ملک خوف سے کانپ رہا ہو یہ آپ کا اکیلا ملک ہے اس لیے کہ آپ نے اپنے پیڈسٹل پر بیٹھ کر باقی لوگوں کو چوڑے چمار اور کمی کمین سمجھا ہے۔ آپ سردار ہیں، میں سردار ہوں، علم دوست ہوں اس لیے اونچے ہیں، یہ کوئی بات نہیں، اصل میں ہمارے اندر سے ابھی برہمن ازم نہیں نکلا۔ ہندوؤں کا برہمن ازم پھر بھی کم ہے۔ پاکستانیوں کا برہمن ازم استکبار کی دنیا میں بیٹھا ہوا ہے، ہر ایک میں تکبر ہے آپ باہر نکل کر بھی دیکھیں۔ اس ملک کا اور اس شہر کا تکبر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ سرخ بتی پر کھڑے ہونے پر ہمیں فخر محسوس کرنا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ کی تعلیم کا بھی قصور ہے۔ ہمیں تعلیم کے دوران ایسی باتیں سکھائی گئی ہیں کہ آپ نے کس طرح سے نوکری کرنی ہے لیکن ہماری تربیت نہیں ہوئی۔ میں روز روتا ہوں میرے اوپر بہت الزام لگتا ہے کہ یہ تعلیم کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے تعلیم نہیں چاہیے، مجھے تربیت چاہیے۔

س ـــــــ جب آپ اس طرح کی بات کرتے ہیں تو دراصل آپ تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں اور پسماندگی کی حمایت کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود آپ مغربی تعلیم کے خلاف ہیں۔ آپ ڈاکٹر کے مقابلے میں حکیم اور پڑھے لکھے موٹر مکینک کے مقابلے میں عام موٹر مکینک کی حمایت کرتے ہیں۔ تو کیا اس سے ترقی کے عمل کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی، اور کیا اس سے آپ لوگوں کو یہ درس نہیں دے رہے کہ آپ پڑھنا بند کر دیں آپ پر الزام ہے کہ آپ ہمیں پسماندگی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

اشفاق احمد ـــــــ دیکھیں! پسماندگی کی طرف کون لے جا رہا ہے۔ میں ڈیڑھ دو سال پہلے کامونکی جا رہا تھا تو وہاں پر لڑکیاں کھیتوں میں مونجی لگا رہی تھیں، میں وہاں پر گاڑی روک کر کھڑا ہو گیا تو وہ بیچاری مجھے پوچھنے لگیں کہ بابا جی آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم گیارہ لڑکیاں

کس طرح سے ایک ہی ترتیب اور سلیقے سے یہ مونجی (دھان) لگا رہی ہو تو وہ کہنے لگیں کہ یہ تو ہمارا شروع سے کام ہے جس پر میں سوچنے لگا کہ شروع سے یہ کام کرنے والی لڑکیاں کتنی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں پھر میں یہاں آ گیا بڑی لمبی کہانی ہے۔ پھر میں نے کہا کہ ہمارے ملک میں جو ایسے کوالیفائیڈ لوگ ہیں ان کو سرٹیفکیٹ دینے چاہئیں۔ میں نے حکومت سے اور نواز شریف صاحب سے بات کی۔ انہوں نے مجھے پیسے دیئے کہ سرٹیفکیٹ چھپوالو لیکن ساتھ ہی کہا کہ لوگ آپ کو طعنے ماریں گے میں نے کہا نہیں یہ لوگ ان پڑھ نہیں کوالیفائیڈ ہیں۔ وہ مونجی لگانے والی زراعت کا ایم اے کرنے والوں سے کم نہیں ہیں، جو یہ کام کر رہی ہیں ان کو اس بات کا علم ہے کہ کب کیا کرنا ہے۔ کیا آپ مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنے کام کرنے والے بندے کی کمر پر ہاتھ مار کر کہوں کہ غلام محمد شاباش ہے بہت اچھی فصل اُگی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں جب تک یہ امریکہ کی یا انگلینڈ کی اصلی زراعت کی تعلیم حاصل کر کے نہیں آئے گا بات نہیں بنے گی۔ ظاہر ہے کہ میں اس بات کو ماننے کو تیار نہیں۔

س ــــ دیکھیں جی! اشفاق صاحب آپ کی بات میں تضاد ہے اور تضاد یہ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ زراعت کے جدید طریقے نہ سیکھے جائیں اگر آپ کی بات مانی جائے تو ٹماٹر اور آلو برصغیر کی پیداوار نہیں تھی اس کو انگریز یہاں لایا لیکن اب ہم سب کھاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زراعت ہو یا سائنس، تعلیم کی جدید روشنی جہاں بھی ملے اسے حاصل کرنا چاہیے۔ اسی لیے تو حضور اکرمؐ کا فرمان ہے کہ علم حاصل کرو چاہیے چین جانا پڑے۔

اشفاق احمد ــــ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، لیکن میں آپ کی بات کا تضاد واضح کرتا ہوں کہ اگر یہاں پر کسی کے پاس دیسی علم ہے تو کیا اس علم کا خاتمہ کر دیں اور کہیں کہ تم نے ٹماٹر اور آلو بیچنے کا علم ولایت سے حاصل نہیں کیا۔ ٹھیک ہے تمہارا آلو بھی بہتر ہے اور تمہارا ٹماٹر بھی بہتر ہے لیکن اس کے اوپر ہاورڈ یونیورسٹی کی مہر نہیں لگی ہوئی اس لیے غلام محمد بھاگ جا۔ پھر آپ کیا کریں گے۔ یہی تو ہو رہا ہے ہمارے برسر اقتدار اور آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بات نہ لکھا کریں کہ کیونکہ ہمارے ملک کی 65 فیصد آبادی ناخواندہ ہے اس لیے یہاں کیا جمہوریت چل سکتی ہے۔ وہ سن لیں گے کبھی وہ جو کندھوں کے اوپر بوریاں رکھ کر آپ کو اناج لاہور پہنچا رہے ہیں ان کو آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ جاہل ان پڑھ لوگ ہیں ان کو کیا پتہ کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ میں چونکہ ایک مصنف ہوں، میرا نام اشفاق احمد ہے اس لیے میں ان سے بہتر ہوں، خدا شاہد ہے کہ یہ رویہ غلط ہے۔

س ــــ کوئی پڑھا لکھا شخص انہیں بُرا نہیں کہتا بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ یہ بھی علم حاصل کریں لیکن آپ

چاہتے ہیں کہ یہ اپنے گنوار پن اور قابلیت پر فخر کریں انہیں ان پڑھ کوئی نہیں کہتا۔

اشفاق احمد ——— نہیں، ہم کہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لوگ ان پڑھ سے بہتر ہیں۔ یہ بات میں کہتا ہوں کہ جس علم کی وہ ان پڑھ تعلیم حاصل کیے ہوئے ہے۔ خواہ اس نے وہ تعلیم کہیں سے بھی حاصل کی اس علم کو بھی کم تر نہ جانا جائے۔

س ——— اشفاق صاحب! آپ تو چاہتے ہیں کہ لوگ پڑھنے لکھنے کی طرف نہ جائیں، نہ ملک کی شرح خواندگی میں اضافہ ہو اور نہ ہی ملک ترقی کر سکے۔

اشفاق احمد ——— شرح خواندگی میں اضافہ ضرور کریں۔ اس کی راہ میں تو کوئی حائل نہیں ہوتا لیکن میں کہتا ہوں کہ جو لوگ تعلیم یافتہ نہیں ہیں ان کی بھی عزت کریں۔ آپ اس سے بھی انکاری ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم برہمن ہیں۔ یہ ہمارے مزارعے ہیں، شودر ہیں، میں کہتا ہوں کہ بند کر دو یہ مذاق اگر یہ مذاق جاری رہا تو بڑا عذاب آئے گا۔

س ——— اشفاق صاحب! اگر ایسا ہو رہا ہے تب بھی یہ آپ کی غلطی ہے کہ آج تک لوگوں کا استحصال جاری ہے؟

اشفاق احمد ——— 14 اگست کو جب انگریز گیا تھا تب تو آپ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے مگر میں پڑھا لکھا آدمی تھا اور بی اے پاس تھا۔ جاتے ہوئے گورا مجھے کہہ گیا کہ اشفاق صاحب یہ چابیاں لیں یہ آپ کا ملک ہے اور آپ نے اسے چلانا ہے۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا کہنے لگا کہ آپ ٹوپی لے کر بیٹھ جائیں تو میں بیٹھ گیا پھر جاتے ہوئے کہنے لگا کہ اس بات کا خیال رکھنا کہ جو شخص آپ کے ابا جی کی شکل کا تہبند باندھ کر آئے اس کو جوتے مار کر بھگا دینا اور جو ہماری شکل کا ہماری وضع قطع کا بندہ آئے اس کو بٹھانا اس کی عزت کرنا، ہم آپ کی مدد کریں گے۔ میں نے کہا کہ آپ تو اتنی دور ہوں گے تو وہ کہنے لگے کہ فکر نہ کریں ہم ساڑھے سات ہزار میل سے آپ کی وہ مدد کریں گے کہ دنیا دیکھے گی۔ ہمارے پاس کالا ڈبہ ہے بی بی سی وہ آپ کی مدد کرے گی اور کہے گی کہ یہی وہ بندہ ہے جس نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔

س ——— اگر نوکر شاہی کا کردار اس قدر خوفناک ہے تو اس کو کیسے بہتر کیا جائے؟

اشفاق احمد ——— اس نوکر شاہی کو بہتر کرنے کے لیے آپ مجھے کوئی درسی کتاب یا اخبار اٹھا کر دکھائیں جس میں کچھ لکھا گیا ہو۔

س ——— موجودہ حکومت اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی کے لیے کام کر رہی ہے اس سے شائد حالات بدل جائیں۔

اشفاق احمد ——— یہی حکومت کام کر رہی ہے نا! لیکن اس کا رخ جو ہے پتہ نہیں کیسے ہوگا، کیونکہ جب تک لوگوں کے دلوں میں احترام آدمیت پیدا نہیں کیا جائے گا تو یہ کیسے ہوگا۔ صرف کچھ اور بندے آجائیں گے ڈی سی کا نام کچھ اور رکھ دیں گے۔ شکلیں بدل جائیں گی باقی چیزیں تو ویسی ہی رہیں گی۔

س ——— کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس خطے کے لوگوں کے اندر کوئی جینٹک خرابی ہے اس کی وجہ سے ان میں بہتر ہونے کی گنجائش کم ہے؟

اشفاق احمد ——— (ہنستے ہوئے) وہ تو ایسی بات ہے کہ ہم یہ الفاظ استعمال کر کے اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں۔

س ——— اشفاق صاحب! آپ کی باتیں بجا سہی لیکن جب بھی اسلامی ممالک یا مشرقی ممالک کے زوال کی وجوہات لکھی جاتی ہیں تو یہی لکھا جاتا ہے کہ پرنٹنگ پریس کے نہ لگانے سے بحریہ کے نہ بنانے سے ہم لوگ سائنس میں پیچھے رہ گئے اور جب سائنس میں پیچھے رہ جاتے ہیں تو آخر کار ایک کالونی بن جاتے ہیں۔ ان معلومات کے باوجود آپ سائنس کی ترقی کے خلاف ہیں۔

اشفاق احمد ——— بالکل ٹھیک ہے (طنزیہ انداز میں) آپ نے بڑی دانشمندی کے ساتھ ترقی کی ہے آپ اسلامی ملکوں میں سب زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ آپ نے سائنس میں ترقی کی ہے۔ بحریہ آپ کی بڑی مضبوط ہے اور آپ نے ایٹم بم بنا لیا ہے۔ اس ترقی کے باوجود آپ مجھے طاقتور بن کر دکھا دیں۔ بندوں کو آپ ساتھ نہیں ملاتے۔ وہ ملک جن کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ ان کے پاس بحریہ کی طاقت نہیں ہوتی تھی لیکن وہ ایک مٹھی کی طرح متحد ہو کر کھڑے ہوتے تھے۔ میری بیوی پرسوں مجھے کہہ رہی تھی کہ انگلستان میں حکومت کرنا سب سے آسان ہے۔ میں نے کہا کہ تم نے تو کبھی سیاست نہیں کی، اخبار ہی نہیں پڑھا تو تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ سیاست کیا ہوتی ہے۔ تو وہ کہنے لگی کہ نہیں میں بڑی کامیاب ہوتی وہ ساری قوم بڑی منظم ہے جس نے دائیں مڑنا ہو، دائیں مڑتا ہے جس نے بائیں مڑنا ہو، بائیں مڑتا ہے، وہاں تو حکومت کرنا ہی بہت آسان ہے۔ (قہقہے) بات تو ٹھیک تھی۔ یہاں پر اشفاق احمد کو تو عزت ملے گی کہ وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں اور مصنف ہیں لیکن ان کے مقابلے میں دوسرے عام آدمی کو عزت نہیں دی جائے گی۔

س ——— جی آپ بجا فرما رہے ہیں۔ ہمارا یہ بھی مسئلہ ہے لیکن میری نظر میں تمام اسلامی ممالک کے دو بڑے مسئلے ہیں کہ ہم سیاسی نظام اور معاشی نظام کے بارے میں ابھی تک کچھ طے نہیں کر سکے اور یہ ساری مسلم دنیا کا مسئلہ ہے، دنیا میں اب بادشاہت کا دور نہیں رہا حالات بدل گئے ہیں اور پوری اسلامی دنیا اس کا حل تلاش کر رہی ہے لیکن ان مسائل کو حل کیا نہیں جا سکا؟

اشفاق احمد ـــــ دیکھیں جی! جو آپ نے اسلامی دنیا کا نام لیا تو 51 کے قریب ملک مسلم ہیں تو آج کل کے ذہین بچوں کے ذہن میں یہ ہے کہ مادی ترقی ہو گی تو پھر ہم ترقی کریں گے۔ ہماری بحریہ مضبوط ہو گی، ہماری فضائیہ مضبوط ہو گی اور ہمارا سائنسی نظام تگڑا ہو گا تو ہم تگڑے ہو جائیں گے۔ ایسا کبھی ہو گا نہیں ہو سکتا نہیں کیونکہ بہت سے گروہ ایسے ہیں جن کے پاس ساری چیزیں مضبوط ہیں، میں گروہوں کی بات کر رہا ہوں لیکن میں اسی بات کا رونا رو رہا ہوں کہ ان کا تعلق پورے ملک کے ساتھ نہیں ہے وہ پورے ملک کو ساتھ لے کر نہیں چل سکتے۔ اگر ہم لوگوں کی مدد سے یہ طاقت حاصل کریں تو پھر ہم طاقتور ہوں گے۔ آپ یہ چاہ رہے ہیں کہ ایک مگرمچھ کا سر سلامت رہے۔ اس کا دھڑ پانی میں جتنا مرضی مردہ رہے اور سر کی سلامتی سے مادی ترقی ہو جائے گی۔ مادی ترقی سے قومیں نہیں بنا کرتیں اس سے افراد بنا کرتے ہیں۔ آپ کو مختلف ذرائع سے متاثر کیا گیا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کہتا ہے کہ پیسے نہیں ہوں گے تو مارے جاؤ گے۔ پرویز مشرف دن رات سوچتے رہتے ہیں کہ ڈالر کیسے بنائے جائیں لیکن میں کہتا ہوں نہیں خالی ڈالر سے کام نہیں بنے گا۔ اس ملک میں زندہ انسان بھی ہیں وہ روٹی کپڑے اور مکان کے مقابلے میں اس کندھے کی تلاش کر رہے ہیں جس پر سر رکھ کر وہ رو سکیں، کیا آپ وہ کندھا مہیا کر سکتے ہیں۔

س ـــــ اشفاق صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو میں اس بات سے تھوڑا سا اختلاف کروں گا۔ آپ جو یہ بات کر رہے ہیں یہ فلسفہ 70ء کی دہائی تک بہت اثر انگیز تھا لیکن موجودہ دور میں مادی ترقی کے بغیر اور معاشی ترقی کے بغیر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

اشفاق احمد ـــــ جی میں سمجھ گیا ہوں آپ کی بات۔ جتنے بھی ترقی یافتہ ممالک ہیں ان میں یہی نظام چل رہا ہے کہ آپ معاشی طور پر تگڑے ہوں۔ بندے آپ کے چاہے بھوکوں مرتے رہیں کوئی بات نہیں۔ یعنی بندوں کی طرف کوئی توجہ نہیں۔

س ـــــ جی نہیں! معاشی ترقی اور مادی ترقی میں سب سے پہلے بندوں کی طرف بھی توجہ دی جاتی ہے۔ بظاہر روسی قوم متحد تھی، پوری قوم اکٹھی تھی ـــــ لیکن معاشی ترقی میں مسئلہ پیدا ہوا اور ملک بکھر کر رہ گیا۔

اشفاق احمد ـــــ روس نے اسلامی نظام کے قریب سود کے بغیر معاشرے بنانے کی 73ء تک کوشش کی۔

س ـــــ کیا کمیونزم اسلام کے قریب ہے؟

اشفاق احمد ـــــ بہت قریب ہے اسلام سود نہیں مانگتا، وہ لوگ خدا کو نہیں مانتے، لیکن باقی وہ معاشی نظام تو وہی چاہتے ہیں جو اسلام کا ہے۔ اس میں تو غیر سودی معاشرہ قائم کرنا پڑے گا۔ آپ کا اسلام بھی یہی کہتا

ہے جب آپ ایسا معاشرہ قائم کرتے ہیں تو آپ کے ہاں اکٹھا کھانا، اکٹھا پہننا، اکٹھا کاروبار ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے ملک میں غیر سودی تجارت کر کے دیکھیں ساری بیروزگاری ایک دم ختم ہو جائے گی۔

س ـــــ تو کیا آپ کے خیال میں کمیونزم میں اگر خدا کو شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام بن جاتا ہے؟

اشفاق احمد ـــــ ہاں جی! مطلب یہ ہے کہ اسلام کی جو دوسری چیزیں ہیں وہ تو ہیں ہی ہیں، اس کے ارکان ہیں لیکن کمیونزم کا تصور اسلام کے بہت قریب ہے کیونکہ یہ انسان کی بات کرتا ہے۔ اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ آپ اپنے پڑوسی کا خیال رکھیں۔ لیکن آپ جن مغربی ملکوں کی بات کرتے ہیں وہاں پر تو پڑوسی کا تصور ہی نہیں ہے۔

س ـــــ لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ اسلام اور آج کی جدید دنیا دونوں نجی ملکیت کی بات کرتے ہیں۔ اسلام اور آج کی جدید دنیا دونوں آزادی کی بات کرتے ہیں اس لیے آج کے مغربی معاشرے کی سوچ اسلام کے زیادہ قریب ہے۔

اشفاق احمد ـــــ آپ کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ پیغمبروں کے پاس کتنی نجی ملکیت تھی۔ دیکھیں نا فلسفہ ایک اور چیز ہے لیکن ہمارے لیے ماڈل تو پیغمبر ہی ہیں نا تو دیکھیں کہ ان کی کتنی نجی ملکیت تھی۔ ظاہر ہے پیغمبروں کے پاس نجی ملکیت بالکل نہیں تھی۔

س ـــــ تو کیا جاگیریں ضبط ہو جانی چاہئیں؟ اور نجی ملکیت بالکل نہیں ہونی چاہیے۔

اشفاق احمد ـــــ نہیں دیکھیں یہ پھر صحافیوں والا سوال ہے کہ ضبط کر لو تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اس سے یقیناً فائدہ ہو گا۔ یقیناً جیسے کہ بھارت بڑا خوش نصیب ملک ہے کہ اس نے ریاستوں کو کالعدم کیا تو ساتھ ہی جاگیروں کو بھی کالعدم کر دیا۔ ٹھیک ہے اس میں ان کی بد نیتی شامل تھی کیونکہ مسلمانوں کی جاگیریں زیادہ تھیں۔ یوپی وغیرہ میں لیکن بھارت بہت بڑے مخمصوں سے نکل گیا۔ ہمارے یہاں سندھ میں تو گاڑی چلتی ہے، تو شام تک چلتی رہتی ہے اور وہ ایک بندے کی جاگیر ہوتی ہے، تو لوگوں کو تو بڑے ظلم سے گزرنا پڑ رہا ہے آپ کی بیوروکریسی سے لے کر آپ کی سرداری تک، آپ کے لوگ بڑے دکھی ہیں اور پھر آپ دردمند ہو کر کہتے ہیں کہ مایوسی کیوں پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ کوئی کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھنے کا روادار نہیں، کچھ نہیں دیتا۔

س ـــــ اصل ناکامی تو اس ملک کے دانشور اور ادیب کی ہے۔ معاشرے کے مسائل کا حل تو دانشور ہی دیتا ہے؟

اشفاق احمد ـــــ ٹھیک ہے، دانشور ہی دیتے ہیں اور اپنی طرز کا دیتے بھی رہتے ہیں لیکن دُکھ یہ ہے کہ ہمارے دانشور بھی صحافیانہ سوچ کے مالک بن چکے ہیں۔ یہ تو میں ہوں جو آپ سے کھل کے بات کر رہا

ہوں۔ دانشور تو وہ ہوتا ہے جو الگ ہو کر بات کرتا ہے اور صحافی اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ آج اس نے کیا بات کی، آج ٹی ایس ایلیٹ نے کیا بات کی۔ اب سارے دانشور تو کالم لکھنے لگ گئے ہیں تو یہ تو خیر نہیں پڑے گی۔ کالم نگاری تو ایک اپنی ڈیمانڈ ہوتی ہے وہ دانشور نہیں ہوتا، دانشور تو ایک کونے میں بیٹھ کر بہت الگ سی بات کرتا ہے کہ لوگ لڑائی کرنے کے لیے آپ کے گھر آئیں کہ سر آپ نے کیا بات کر دی۔ آپ تعلیم کے خلاف ہیں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ مہد سے لحد تک تعلیم حاصل کرو۔

حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ہر مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ پھر میں اس کو جواب دوں گا کہ میں اسی تعلیم کی بات کرتا ہوں جس کا نبی کریمؐ نے ذکر کیا ہے۔ یہ والی جدید تعلیم جو آپ نے 6 ہزار روپے فیس والی تعلیم نکالی ہے جو کہ میرا پوتا حاصل کر رہا ہے یہ والی تعلیم میں نہیں چاہتا۔ یہ تو آپ کو دھوکا دیا جا رہا ہے آپ یہ تعلیم لیتے رہیں۔

س ــــــ اور کیا کیا جائے؟ اس کے مقابلے میں درس نظامی کی جو تعلیم ہے اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس تعلیم سے نہ نوکری ملتی ہے اور نہ معاشرتی طور پر ہی ڈیویلپمنٹ ہوتی ہے۔

اشفاق احمد ــــــ آپ ڈویلپمنٹ کسے کہتے ہیں جس کا لہجہ انگریزی ہو۔ جو شیڈول کو سکیجوعل کہتا ہو کیا وہ زیادہ لائق ہو جاتا ہے۔

س ــــــ تو کیا آپ کا خیال ہے کہ درس نظامی بی اے سے بہتر ہے؟

اشفاق احمد ــــــ درس نظامی اپنے مقام پر بی اے سے بہتر ہے۔ کل کو آپ مجھ سے پوچھیں گے (طنزیہ انداز میں) کہ ایل ایل بی، ایم بی بی ایس سے بہتر ہے۔

س ــــــ نہیں اب دیکھیں نا! جب آپ اس تعلیم کی حمایت کریں گے تو موازنہ تو کرنا پڑے گا۔

اشفاق احمد ــــــ تین شعبے ایسے ہیں جو معاشرے میں بہت طاقتور ہیں اور جن پر ہماری بہت توجہ ہے اور ہم ان پر توجہ دینے پر مجبور ہیں۔ جب آپ کو جسمانی عارضہ ہوتا ہے تو آپ ڈاکٹر کو رجوع کرتے ہیں۔ جب آپ پر خدانخواستہ بے انصافی کا کوئی دباؤ پڑتا ہے تو آپ وکیل سے رجوع کرتے ہیں۔ جب آپ کا دین کا کوئی معاملہ ہوتا ہے تو آپ مولوی سے رابطہ کرتے ہیں اور اگر نہیں کرتے تو کریں، میرے ساتھ آج سے 35 سال پہلے یہ واقعہ گزرا۔ ایک دن عید کے روز میری بیوی بے چین پھرتی رہی کہ آج کے روز ایک فطرانہ دینا ہوتا ہے وہ کتنا ہوتا ہے میں نے کہا کہ میری ماں تو گیارہ آنے دیا کرتی تھی اس نے کہا کہ نہیں وقت بدل گیا ہے ہم پریشان ہو گئے۔ میں نے کہا کہ انسائیکلو پیڈیا نکالو لیکن اس میں سے بھی نہیں ملا پھر میں

نے جامعہ اشرفیہ فون کیا اور ان سے پوچھا کہ فطرانہ کتنا ہے تو انہوں نے کہا کہ 3 روپے 30 پیسے۔ میری مشکل حل ہوگئی اور میں نے اس حساب سے فطرانہ ادا کر دیا۔ مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ ملا کیوں بیٹھا ہوا ہے اس کو جوتے مار کر باہر نکالو کیا ہم دین کا مسئلہ خود نہیں جانتے۔ اکثر ایسی باتیں کرتے ہیں کہ اسلام میں ملائیت کی گنجائش ہی نہیں ہے اس پر میں کہتا ہوں کہ قانون میں وکیل کی گنجائش ہی نہیں میں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ میں قانون پڑھ سکتا ہوں تو وکیل کی کیا ضرورت ہے، میں اپنا کیس خود لڑ لوں گا۔ کل کو آپ کو کوئی تکلیف ہو پیٹ میں اور آپ یہاں آ جائیں تو میں کہوں کہ یہ تو اپنڈکس ہے جلدی سے لیٹ جاؤ میں چھری لاتا ہوں میں نے کتاب پڑی ہے اور وہ پاس رکھ کر تمہارا آپریشن کر دوں گا لیکن آپ کہیں گے کہ مجھے مرنا منظور ہے لیکن میں تم سے آپریشن نہیں کراؤں گا۔

س ـــــ تو کیا آپ کا خیال ہے کہ ملا کا ہونا ضروری ہے؟

اشفاق احمد ـــــ میرا یہ خیال نہیں۔ میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ بتائیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس پر غور کیا جانا چاہیے۔ میں درس نظامی والوں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ یہ آپ کا اتنا پرانا سلیبس ہے اس میں کوئی تبدیلی کریں جس پر انہوں نے کہا کہ ہم اس میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے لیکن آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ اپنے بچوں کو فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی ضرور پڑھائیں تاکہ جب کبھی ہمیں کوئی کام ہو، کوئی بیماری ہو، تو ہم آپ کے پاس آئیں اور جب کبھی آپ نے کوئی دینی مسئلہ پوچھنا ہو تو آپ ہمارے پاس آئیں۔

دیکھیے عزیز من! جان ہمیں بہت پیاری ہے ہم ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتے ہیں، عزت ہمیں بہت پیاری ہے ہم وکیل کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن ایمان ہمیں پیارا نہیں ہے اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ہم ملا کو کیوں رکھیں۔ اس لیے درس نظامی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے بڑی اچھی بات کی کہ درس نظامی کے کورس کو ماڈرن کرنے کے لیے آپ ہمیں جو کہہ رہے ہیں یہ بالکل اسی طرح ہے کہ کل کو آپ کہیں کہ ایل ایل بی کے کورس میں ٹیڈی بکریاں پالنے کے طریقے پڑھائے جائیں اور ایم بی ایس کے کورس میں جوئیں مارنے کے طریقے پڑھائے جائیں (ہنستے ہوئے) اللہ کے واسطے کچھ سوچیں۔

س ـــــ اشفاق صاحب جب آپ نے ملا کی حمایت شروع کی تو اس وقت کے ملا میں اور آج کے ملا میں بہت فرق ہے اس وقت کا ملا ایک مظلوم اور غریب آدمی تھا آج کا ملا بہت طاقتور ہے اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے تو کیا اب بھی آپ اس کی حمایت کرتے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ میں اس کی پہلے سے زیادہ حمایت کرتا ہوں کیونکہ میں اس سے روز ملتا ہوں میں نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جاتا ہوں میں نے ملا کو وہی پایا ہے جو آج سے 20 برس پہلے تھا۔ یہ جو کلاشنکوف والے ہیں، یہ ملا نہیں ہیں۔ اللہ کے واسطے یہ ملا نہیں ہیں۔ یہ سیاستدان ہیں جنہوں نے مولوی کا چولا پہنا ہوا ہے۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں یا مافیا ہیں یہ ملا نہیں ہے۔ ملا سے میں آپ کو ملاتا ہوں جو جمعدار سے کم تنخواہ لے رہا ہے۔ 630 روپے تنخواہ لیتا ہے اور جمعہ کو خطبہ دیتا ہے۔ پلیز اصلی ملا کی پشت پناہی کریں اور ان بدبختوں سے جان چھڑائیں۔

س ـــــ یہ تو پھر جہاد کرنے والے کون ہیں۔

اشفاق احمد ـــــ کون۔۔۔۔؟

س ـــــ کلاشنکوف کے ساتھ جہاد بھی تو کیا جا رہا ہے، کیا آپ اس جہاد کو جائز سمجھتے ہیں۔

اشفاق احمد ـــــ ہاں ہاں! اگر آپ کے محلے کا ملا اس کی منظوری دیتا ہے تو یہ جہاد جائز ہے لیکن اگر کوئی کہتا ہے کہ تم جا کر شیعہ کو مار دو تو اس بات کی منظوری مولوی نہیں دے گا۔

س ـــــ اشفاق صاحب! آپ کیا بات فرما رہے ہیں۔ کچھ مولوی تو ظاہر ہے منظوری دیتے ہیں تبھی تو فرقہ وارانہ دہشت گردی چلتی ہے۔

اشفاق احمد ـــــ یہ ایک مافیا ہے۔ جس بندے نے چلایا آپ کل مولوی کے روپ میں کوئی سکیم چلا دیں۔ داڑھی رکھ لیں اور چھوٹے چھوٹے ڈبوں والا عمامہ باندھ لیں۔ مافیا بن جائیں وہ جیسے چھوٹا شکیل ہے۔ ان لوگوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں یہ بندے سارے جن کے بڑے بڑے نام ہیں مولوی نہیں ہیں۔ ان کا کلاشنکوف سے ان کا پیسے سے، ان کا باہر کی دولت سے تعلق ہے، ان کے خلاف ڈٹ کر جہاد کریں۔ جب آپ ملا کہہ دیتے ہیں تو ساری کی ساری برادری شمار ہوتی ہے اور پرویز مشرف بھی کہہ دیتے ہیں کہ ملا نے برباد کر دیا۔ ان کو کچھ نام دیں لیکن خدا کے واسطے یہ ملا نہیں ہیں یہ مولوی نہیں ہیں یہ عطائی ملا ہیں جس طرح عطائی ڈاکٹر ہوتے ہیں یہ اسی طرح کے عطائی ملا ہیں۔

س ـــــ جہاد کے نام پر افغانستان اور کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے تو بطور ادیب تو ہندو کی جان جائے یا مسلمان کی جائے یا کسی کی بھی جان جائے کیا وہ برابر ہے یا یہاں سے جب کوئی معصوم نوجوان جاتا ہے تو اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کیونکہ سیاسی حلقے اس بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ مثلاً بیگم کلثوم نواز نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ شوقیہ جہاد جائز نہیں ہے اور فتوے موجود ہیں کہ جب تک

ریاست اعلان نہ کرے جہاد جائز نہیں ایک تو یہ رائے ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ نہیں ہر بندہ جہاد میں شامل ہے آپ کی کیا رائے ہے۔

اشفاق احمد ـــــ کشمیر میں لڑنے والے فریڈم فائٹر ہیں۔ آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

س ـــــ اچھا تو کیا یہ جہادی نہیں ہیں؟ کیا وہ جہاد نہیں کر رہے۔

اشفاق احمد ـــــ یہ جہادی کا لفظ تو انہیں خاص معنی دے دیتا ہے۔ ٹائمز اور نیوز ویک والے یہ لکھتے ہیں دیکھیے ہم پڑھے لکھے لوگ ہیں ٹائمز اور نیوز، نیوز ویک پڑھتے ہیں تو ہم تو ان کی ٹرم ہی استعمال کریں گے۔ ہم کو اتنی عقل تو نہیں آئے گی۔

س ـــــ سر! ایسی بات نہیں ان کا خود بھی یہی موقف ہے کہ ہم جہاد کرنے جا رہے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ وہ بالکل کہیں کہ جہاد کرنے جا رہے ہیں لیکن اس کو دوسرے سارے ممالک کیا کہہ رہے ہیں کہ وہ قاتل ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ نہیں۔ میرا تو ہر ہفتے اپنے ریڈیو پر پروگرام میں انڈیا والوں سے ''اٹ کھڑکا'' رہتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ یہ فریڈم فائٹر ہیں اور اسی فلسفے کے تحت لڑ رہے ہیں جس فلسفے کی بات سبھاش چندر بوس نے کی تھی۔ یہ سبھاش چندر بوس کے اصول کے مطابق لڑ رہے ہیں۔ اپنے ملک کو غیر کے قبضے سے چھڑ وانا جائز اور حق ہے اور اس جدوجہد کو کرنے والے فریڈم فائٹر کہلاتے ہیں۔

س ـــــ آپ اسے جہاد کا نام نہیں دیتے؟

اشفاق احمد ـــــ میں جہاد کا نام اس لیے نہیں دیتا کہ جہاد کو ان ورٹڈ کوماز'''' میں رکھ کر ہم کو ذلیل وخوار کیا جا رہا ہے۔

س ـــــ اشفاق صاحب! آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ یہ ہے تو جہاد، لیکن ہمیں اسے جہاد کہنا نہیں چاہیے۔

اشفاق احمد ـــــ چاہیے یا نہ چاہیے کہ مختلف وجوہات ہیں جی میری سوچ میں، مَیں کہتا ہوں اپنے ساتھیوں کو یہاں اور اپنے بڑوں کو جو ولایت میں پھیلے ہوئے ہیں، میں ہنری کسنجر کو کہتا ہوں یہ فریڈم فائٹر ہیں۔

س ـــــ جہاد کی وجہ سے تو پاکستان کشمیریوں کی مدد کر سکتا ہے ورنہ پاکستان کے لوگ جا کر فریڈم فائٹر کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ ہر کوئی کر سکتا ہے۔ جب میں سپین جا کر فرانکو کے خلاف لڑ سکتا ہوں تو پاکستانی کیوں نہیں لڑ سکتے۔ بہت سے پاکستانی تو سپین میں جا کر فرانکو کے خلاف بھی لڑے تھے۔ میرا اپنا بہنوئی گیا تھا۔ امریکہ سے ارنسٹ ہیمنگوے جیسا بڑا ادیب وہاں آیا تھا وہ لڑائی کرتا رہا۔ دنیا میں مظلوم کو بچانا تو آپ کا فرض ہے۔

س ـــــ اصل میں بات فلسفہ جہاد کی ہو رہی تھی آپ اس بارے میں اپنا موقف بتائیں۔

اشفاق احمد ـــــ جہاد کا تو ہمیں حکم ہے۔ اگر مجھے جہاد کا حکم دے دیا جائے تو میں تیار ہو جاؤں گا۔

س ـــــ آپ ملا کی حمایت کرتے ہیں لیکن اگر اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ملا کو کبھی عوامی حمایت حاصل نہیں رہی بلکہ سارا لٹریچر صوفیا کا لکھا ہے۔ جس میں ملا کو پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا آپ کس بنیاد پر ایسا کرتے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ اسلامی تاریخ میں ملا ہی تھا جو اسلام کے کاروان کو لے کر میرے باپ تک لے کر آیا اور جب میں پیدا ہوا تو میں مسلمان تھا۔ صوفی نے جا کر اسلام ان علاقوں میں پھیلایا جہاں پر اسلام نہیں تھا اور ملا نے ایک فائٹر کی طرح وردی پہن کر اس کی نگہداشت کی آپ کی جان عذاب میں ڈالی وہ آپ کو مسلمان رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر ملا نہ ہو تو لوگ تو یہاں پر ننگ پرنگ ہو کر راتوں کو پتہ نہیں کیا کیا کرتے پھریں اور کہیں کہ یہ انسانیت کے نام پر ہو رہا ہے۔ انسانیت ایک اتنا گندہ لفظ ہے اور اتنا واہیات لفظ ہے کہ اس کے اوپر جو بندہ انسانیت کی بات کرتا ہے اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا میرے پاس لوگ آتے ہیں کہ ہم انسانیت کی بات کرتے ہیں لیکن وہ اتنے آزاد خیال ہوتے ہیں کہ انسان اس طرح بھی ہو تو کوئی بات نہیں۔ یہ فقرہ لکھنے کو مشکل ہو گا لیکن یاد رکھیں کہ انسانیت کو آپ لوگوں نے ایسا ڈھکوسلا بنایا ہوا ہے۔ جس کے کور کے نیچے چھپ کر آپ لوگوں پر حملہ کرتے ہیں اور اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

س ـــــ صوفی اور ملا تو بالکل دو متضاد رویے ہیں لیکن آپ صوفی کے بھی حمایتی ہیں اور ملا کے بھی۔۔۔؟

اشفاق احمد ـــــ بہت زیادہ میں صوفی کا بہت حمایتی ہوں وہ اس لیے کہ صوفی دین کا عملی رخ پیش کرتا ہے۔ ملا دین کا فکری رخ لے کر چلتا ہے میں نے آپ سے کہا نا کہ ملا ظالم، سخت اور سیاسی بن کر چلتا ہے۔ اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ایک محبت کے ساتھ ذکر کرنے والا ہوتا ہے اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے یہ دونوں پول ہیں ایک مثبت اور دوسرا منفی جس سے بلب جلتا ہے۔ آپ کسی ایک کو مثبت اور کسی دوسرے کو منفی کہہ سکتے ہیں۔ میں اس عام مثبت اور منفی کی بات نہیں کر رہا بلکہ بجلی کی رو میں استعمال ہونے والے مثبت منفی پولز کی بات کر رہا ہوں جو کہ ایک دوسرے کے لیے ضروری ہوتے ہیں یہ دونوں ہوں گے تو بلب جلے گا خالی صوفی یا ملا بلب نہیں جلا سکتے۔ اسلام کی عملی زندگی کا نمونہ صوفی پیش کرتا ہے خود اس پر عمل کر کے اور مولوی کہتا ہے کہ اگر تم نے مجھ سے کوئی بات پوچھنی ہے تو میں تمہیں قرآن و سنت کی بات بتا دیتا ہوں تم سے اس پر عمل ہوا جاتا ہے یا نہیں ہوا جاتا۔

س ـــــ لیکن سر اگر ملا اتنا ہی آئیڈیل ہوتا تو معاشرے کا پسندیدہ آدمی ہوتا۔

اشفاق احمد ـــــــ اتنا ہی آئیڈیل ہو ملا تو اب تک زندہ نہ رہے۔ یہ تو چلتا رہے گا۔ یہ کاروان اسلام کا چلتا رہے گا اور ملا اس میں اسی طرح زندہ رہے گا۔ میں نے بڑی کوشش کی اس کو نکالنے کی، علامہ اقبال نے بھی یہ کوشش کی میں تو چھوٹا آدمی ہوں، مولانا روم نے بھی کی لیکن یہ تو چلے گا، یہ چوکیدار ہے یہ آواز دیتا رہے گا سیٹی بجاتا رہے گا کہ خبردار!

س ـــــــ علامہ اقبال کی بات نہیں مانی کونسی بات اور کس نے نہیں مانی؟

اشفاق احمد ـــــــ نہیں مانی۔ یہ ملا اسلام سے نکل ہی نہیں سکتا۔ علامہ اقبال بہت بھلے آدمی تھے وہ بیچارے روز سوچتے تھے انسانیت کے نام پر انہوں نے بھی بڑی بات کی ہے، اسلام کے نام پر انہوں نے بات کی ہے، صوفی کے نام پر انہوں نے بات کی ہے۔ اس ملا کو نکالو لیکن یہ ملا بڑا ٹیڑھا ہے ملا میں اتنی کجیاں ہیں کہ آپ ان کو گننے بیٹھ جائیں تو آپ کو شام پڑ جائے لیکن اس کے باوجود میرے باپ کو اسلام تک لانے والا وہی ملا ہے۔ دیکھئے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں ایک ملا کو پھانسی کی سزا ہوگئی وہ بھاگا اور چلتا چلتا آسام کے جنگلوں میں پہنچ گیا وہاں ایک جگہ پر چھپ گیا وہاں بڑے بڑے نرسل ہوتے ہیں جہاں پر ہاتھی چھپ سکتے ہیں۔ اس نے وہاں پر دیکھا کہ جولاہے بیٹھے کپڑا بن رہے تھے ان جولاہوں سے اس نے پوچھا کہ کون ہو، تو انہوں نے بتایا کہ ہم مسلمان ہیں اس نے کہا کہ کلمہ سناؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم کو تو نہیں آتا اس نے پوچھا کہ تمہارا رسول کون ہے انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں نہیں پتہ لیکن ہیں مسلمان کیونکہ ہمارے دادا پردادا مسلمان تھے۔ اس نے کہا کہ دیکھو پتھر اکٹھے کرو۔ پتھر اکٹھے کر کے اس نے ایک کوٹھری بنائی اس کو دروازہ لگایا اور ان سے کہا کہ میں یہاں کھڑا ہو کر ایک آواز نکالا کروں گا تم اس وقت اپنا کام چھوڑ کر یہاں پہنچ جایا کرنا چنانچہ وہ وہاں پر اذان دینے لگا اور وہ لوگ اس کی آواز سن کر وہاں پہنچ جاتے اور جس طرح وہ کرتا اسی طرح وہ بھی نماز پڑھتے جاتے اسی طرح دو تین سال بعد انگریز کے ہاتھوں وہ پکڑا گیا اور اس کو ہتھکڑی لگ گئی تو سارے جولاہے رونے لگے کہ ہمارا لیڈر پکڑا گیا اور مسجد کو تالا ڈال دیا تو اس نے جاتے ہوئے ان سے کہا کہ مجھے تو یہ کالے پانی لے کر جا رہے ہیں لیکن تم کو وہ وقت یاد ہیں تم اتنی اوقات میں اسی طرح اس مسجد کے باہر آ کر اسی طرح کرتے رہنا کیونکہ ان بیچاروں کو ابھی پوری نماز نہیں آتی تھی تو وہ ویسے ہی کرتے رہے۔ 231 سال گزرنے کے بعد جب ریفرنڈم ہوا تو وہ علاقہ پاکستان میں شامل ہوا یہ سلہٹ کا علاقہ تھا وہ مسلمانوں اور ملا کی وجہ سے شامل ہوا انہوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں ہم تو مشرقی پاکستان میں شامل ہوں گے تو یہ تو چلے گا مجبوری ہے۔ اگر اس

کے ساتھ دوستی کرلو گے تو ریلیکس ہو جائے گا۔ اس کو تو ہم نے معاشرے کا ''شودر'' بنا کر رکھا ہوا ہے۔ کسی بھی پڑھے لکھے آدمی سے پوچھیں سوائے میرے صرف میں ہی ان کو لے کر چلتا ہوں کہ اللہ کے واسطے ان سے ملو۔ میں نے جنرل مشرف سے کہا کہ ان سے ملو تو کہنے لگے کہ نہیں۔ میں نے تو کہا کہ ملا سے ملو۔ انسان ہونے کے ناطے ملو اور ان سے پوچھو کہ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ مشرف کہنے لگے کہ جب میں کرنل تھا تو ایک مرتبہ اباجی نے بکرا دیا تھا کہ جاؤ جا کر یہ بکرا اور چاول وغیرہ پہنچا کر آؤ تو میں اس وقت میں گیا تھا تو میں نے دیکھا کہ ان کے بستر وغیرہ بڑے اچھے تھے اور بڑے اچھے لوگ تھے اور میں نے ان سے باتیں بھی کیں لیکن اب کبھی نہیں ملے۔

س ــــــ جنرل مشرف سے آپ کی کیا کیا باتیں ہوئیں؟

اشفاق احمد ــــــ وہ بہت لمبی باتیں تھیں وہ بڑے غور سے سنتے رہے اور کہنے لگے کہ یہ بڑی اچھی باتیں ہیں یہ تو ٹی وی پر بھی آنی چاہئیں لیکن وہ اس بات پر آپ کی طرح ضد پر اڑے ہوئے تھے کہ پیسے زیادہ ہوں گے تو ہم ترقی کریں گے نہیں ہوں گے تو نہیں کریں گے۔ میں نے کہا پرویز میاں! پیسے تو سعودی عرب کے پاس بھی بہت زیادہ تھے جس پر وہ کہنے لگے کہ نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے۔

س ــــــ آپ کو جنرل مشرف کیسے لگے؟

اشفاق احمد ــــــ بہت اچھے اور Well Meaning آدمی لگے وہ ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی باتوں میں یہ آرزو تھی کہ اس ملک کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے اور آپ ہمیں گائیڈ کریں کہ کیسے کیا جائے۔ میں تو اخبار بھی بڑے غور سے دیکھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اخبارات سے آپ کو کوئی اتنی زیادہ راہنمائی نہیں ملے گی۔

س ــــــ آپ اخبار والوں سے کچھ ناراض لگتے ہیں؟ اور مسلسل اخبارات کے خلاف ہی بات کرتے ہیں۔

اشفاق احمد ــــــ میں ناراض نہیں ہوں میں تو ان پر ترس کھاتا ہوں جو ملا کے خلاف ہیں ان پر بھی ترس کھاتا ہوں۔

س ــــــ آپ کی باتیں بڑی دل نشین ہوتی ہیں لیکن افسوس دنیا بھر میں حقائق ان سے متضاد ہیں دنیا میں ترقی تب ہوئی جب انہوں نے ریاست اور مذہب کو الگ کیا اور پوری دنیا میں مذہبی حکومت کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔

اشفاق احمد ــــــ دنیا کے مذاہب انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے رہنے کا درس دیتے ہیں کسی مذہب نے یہ نہیں لکھا کہ اپنے محلے دار کو کھینچ کر تھپڑ مارو اور اس کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دو۔

س ــــ یورپ نے جب تک چرچ اور سٹیٹ کو الگ نہیں کیا ترقی نہیں کی۔

اشفاق احمد ــــ آپ اس کو ترقی کہتے ہیں کہ جو یورپ اب ہے یہ جو مرد مرد سے شادی کر رہا ہے یہ ترقی ہے۔ نہیں بھائی یہ ترقی نہیں ہے۔ ماں باپ پاس ہیں اور نہ بچے۔ لیکن تمہارے جیسے نوجوان کہتے ہیں کہ وہاں پر اخلاقیات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہاں پر اخلاق نہیں، اخلاق کا عکس ہے جو آپ کو نظر آتا ہے۔

س ــــ نہیں سر! وہاں پر بڑی انسانیت ہے وہاں پر ہر ایک کی دیکھ بھال کا بھرپور نظام ہے سوشل ویلفیئر ہے۔

اشفاق احمد ــــ (ہنستے ہوئے) ایسا ہی لگتا ہے جا کر ان سے پوچھو کہ اے انسانیت کی دیوی فاک لینڈ پر کیوں حملہ کرنے گئی تھی۔ اے انسانیت کے بچو ڈیزرٹ سٹارم میں حملہ کیوں کیا تھا۔ ان سے تو ہم دو ٹکے کے آدمی بہتر ہیں۔ ایک ایک سے سوال کر کے پوچھیں آپ حیران ہو جائیں گے۔

س ــــ وہاں تو انسانیت کی توہین نہیں ہوتی اگر کسی دفتر میں چلے جائیں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ کی بات نہ سنی جائے وہاں پر ٹریفک کی خلاف ورزی نہیں ہوتی کسی ہسپتال میں چلے جائیں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مریض پر توجہ نہ دی جائے اور یہاں جہاں پر آپ انسانیت کی بات کرتے ہیں وہ تو یہاں ہے ہی نہیں میں یہ بات کر رہا تھا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغربی یورپ کی ترقی میں اس بات کا بہت کردار ہے جب انہوں نے سٹیٹ سے مذہب کو الگ کیا۔ جب تک چرچ آف انگلینڈ اور چرچ آف روم کی سلطنت کے ماتحت تھا اس وقت تک سائنسی ترقی نہیں ہوئی۔ اسی طرح برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے جن کو ہم سنہری ادوار کہتے ہیں اس نے اس کو تاریک ادوار لکھا ہے تو کیا آپ دنیاوی ترقی اور سائنسی ترقی کو ترقی نہیں سمجھتے؟

اشفاق احمد ــــ میں اسے بہت زیادہ ترقی سمجھتا ہوں لیکن یہ صرف دنیاوی ترقی ہے اس میں روحانی ترقی کو جمع کیا جائے تو یہ دونوں مل کر ترقی کے عمل کو مکمل کرتی ہیں۔ دیکھیں انسان جانور نہیں ہے جب آپ مادی ترقی کی بات کرتے ہیں تو انسان کو بطور جانور لیتے ہیں کہ اس کی کچھ ضروریات ہیں۔ دیکھئے! انسان اور بھینس میں یہ فرق ہے کہ جب بھینس کھیت سے گزرتی ہے تو ادھر بھی منہ مارتی ہے اور اُدھر بھی منہ مارتی ہے۔ انسان اس سے اوپر ہیں۔ انسان جب اعلیٰ درجے کے کھانے کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو کوئی بھی چیز اٹھا کر نہیں کھاتا لوگوں کی خدمت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا روزہ ہے۔ جس ترقی کا آپ ذکر کرتے ہیں اس کے لیے پھر آپ کو پیچھے جانا پڑے گا اور سپین کی حکومت دیکھنا پڑے گی جہاں سے سائنس کی ابتداء ہوئی۔ وہ جو ملاں لوگ تھے انہوں نے گتوں کی مرلیاں بنائی اور شیشہ لگا کر ستاروں کی چالیں دیکھتے تھے۔

انہوں نے کہا کہ فلکیات کا علم کیا ہے میں اپنی بات نہیں کرتا مغربی تاریخ دانوں کی بات کرتا ہوں۔مسلم سائنس دانوں کی بات کر رہا ہوں۔ یہ اسلامی ریاستیں تھیں ملا لوگ بیٹھے ہوئے تھے، اذان ہو جاتی تھی تو نماز پڑھنے چلے جاتے تھے اور پھر واپس آ کر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ان کی کچھ تحقیق ٹھیک ثابت ہوئیں اور کچھ غلط جیسا کہ سائنس میں ہوتا ہے۔لیکن آپ کی کیمسٹری کا علم سارے کا سارا وہیں سے ہے۔ کیمسٹری کا لفظ ہی الکیمیا ان سے چلتا ہے۔فزکس کی جو عدسوں کی تھیوری ہے آپٹکس کی وہ جابر بن حیان بکرے کی آنکھ نکال کر اس پر تجربے کرتا رہتا تھا پھر اس نے لینز کا آئیڈیا دیا پھر لینز کو اس نے عدسہ کہا عدسہ اس لیے کہا کہ اس کی شکل میسور کی دال جیسی تھی جب انگریز آئے اور انہوں نے اس کا عربی سے ترجمہ کیا تو اس کو لینز بنا دیا۔ میں تو چونکہ سائنس بورڈ میں رہا ہوں اس لیے مجھے پتہ ہے۔ان میں خرابی یہ بھی کہ وہ ظاہری ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی بھی مانگتے تھے۔

س ——— روحانیت تو ہم میں بہت ہے مادی ترقی نہیں ہے۔ یہ پنکھا بھی ہم نے وہاں سے لیا ہے بجلی بھی مغرب سے آئی ہے۔ ہم صبح شیو بھی اس بلیڈ سے کرتے ہیں جو وہاں سے آتا ہے کیونکہ وہ اچھا ہے۔ گزارش یہ ہے کہ ان کی پراگرس ہے۔

اشفاق احمد ——— میں آپ سے یہی عرض کر رہا ہوں اور آپ یہی لکھیے کہ میں مادی ترقی کو پراگرس سمجھتا ہوں لیکن ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ دوسری طرف بھی جھکاؤ ہو ورنہ یہ ترقی یکطرفہ ہو جائے گی۔

س ——— آپ کی بات درست ہے لیکن سائنسی ترقی اور مادی ترقی کے کچھ پیمانے ہیں اس کا طریقہ کار ہے۔لیکن جس روحانی ترقی کی آپ بات کر رہے ہیں نہ تو اس کا کوئی مخصوص طریقہ ہے اور نہ ہی اس کا اس طرح سے کوئی نتیجہ سامنے آتا ہے۔

اشفاق احمد ——— روحانی ترقی کی جو بات ہے تو اس کا عام دنیاوی کتابوں میں تو نہیں لیکن قرآن پاک میں اس کا طریقہ کار بتایا گیا ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ اگر تم اللہ کی راہ میں ایک دانہ دو تو تمہیں اس کے بدلے 70 ملیں گے تو یہ ایک طریقہ ہے ہم اس کو 5، 7 یا 10 مرتبہ چیک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں یہ تو غلط بات ہے میرے تو پیسے کم ہو گئے ہیں اور رونا شروع کر دیں گے اس بات کا انتظار نہیں کریں گے کہ دیکھیں پیسے بڑھتے ہیں یا نہیں لیکن کچھ لوگ ہمیں ایسے بھی ملے ہیں جنہوں نے اس طریقہ کار کو سمجھا ہے اور اس پر عمل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ سو فیصد درست ہے۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھی بات کرو۔ یہ عمل کی بات ہے روحانیت میں تو میتھاڈالوجی ہی میتھاڈالوجی ہے جب آپ قرآن کے جز و نکالیں گے تو

حیران رہ جائیں گے کہ مارے گئے ہماری زندگی کا تو ایک لمحہ بھی ایسا نہیں بنتا جس کا ہمیں حکم ہے۔ کہ زمین پر اکڑی بجا کر نہ چلو اللہ فرماتا ہے کہ نہ تم زمین کو پھاڑ دو گے اور نہ تمہاری اونچائی میں اضافہ ہوگا تکبر کی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ اس کو ٹھپا رہنے دو یہ ترقی ہے۔ میں کہتا ہوں اور اس کے ذریعے سے آپ کو اور ساری قوم کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ دنیاوی ترقی کی طرف تو چل رہے ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی ترقی تو کر جائیں لیکن آپ بہتر انسان نہ رہیں اور ویسے ہی انسان بن جائیں جیسے مغربی دنیا میں ہیں جو کہ انسانیت کا عکس ہیں انسانیت نہیں ہے۔ انسان ہونا بڑی اور بات ہے۔

س ـــــ تو آج کوئی آئیڈیل انسان ہے؟

اشفاق احمد ـــــ جی بہت۔ بہت سارے جو انصاف کے ڈنڈے کو پکڑ کر کھڑا ہے وہ آئیڈیل انسان ہے مثلاً کوئی بھی ملک آپ لے لیں۔

س ـــــ پھر کوئی جگہ تو بتائیں؟

اشفاق احمد ـــــ کوئی نہیں ہے۔ مغرب میں تو کوئی نہیں ہے، مشرق میں شاید کوئی ہو۔

س ـــــ ملائشیا

اشفاق احمد ـــــ نہیں مہاتیر نے بھی دنیاوی ترقی کی ہے لیکن اب میں نے اس کی کتاب پڑھی ہے اب وہ اس بات کی آرزو کر رہا ہے کہ دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنا آپ بھی بلند کرنا چاہیے جب تک ایسا نہیں ہوگا یہ بلندی ساتھ نہیں چل سکے گی۔ مغرب میں تو کوئی ایسا نہیں ہے جس کو رول ماڈل قرار دیا جا سکے۔ میرے رول ماڈل تو اور طرح کے ہیں۔

س ـــــ مثلاً۔۔۔؟

اشفاق احمد ـــــ میرے پرانے پُرکھ جو تھے جو میٹریل ترقی میں پیچھے تھے لیکن انسانی ترقی میں آگے تھے۔ خلفائے راشدینؓ سے لے کر پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز وغیرہ۔

س ـــــ موجودہ دور میں کون ہے؟

اشفاق احمد ـــــ موجودہ دور میں تو ہمارے سب پڑھے لکھے لوگ ہی ہیں جو میٹریل گین چاہتے ہیں۔ دیوبند سکول کے کچھ لوگ ایسے نظر آتے ہیں جن کی میں نے تاریخیں پڑھی ہیں، میں ان سے ملا تو نہیں جنہوں نے انسانیت کے نام پر کام کیے۔ مثلاً میں کل ہی پڑھ رہا تھا کہ مولانا ضامن سے صاحب نسبت کوئی جاگیردار تھے۔ ان کے گھر چوری ہوگئی تو انہوں نے کہا ایک جولاہے کو بلایا جو کہ بیچارہ شریف آدمی تھا

نمازی تھا، وہ ڈر گیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہی چور ہے۔ اس کو پکڑ کر انہوں نے مارا وہ روتا ہوا مولانا قاسم کے پاس چلا گیا کہ جناب میں تو غریب آدمی ہوں اور انہوں نے مجھے ناجائز مارا ہے۔ انہوں نے جاگیردار کے نام رقعہ لکھا کہ کس عذر شرعی کے تحت آپ نے اسے مارا ہے یہ ابھی سے تیار کر لیں کیونکہ یہ آپ سے پوچھا جائے گا۔ وہ خط جب ان کو ملا تو وہ آئے تو شاگردوں نے بتایا کہ مولانا سو رہے ہیں جس پر انہوں نے کہا کہ ان سے کہو کہ ایک کتا آیا ہے دنیا کا، کہو تو بیٹھا رہے نہیں تو وہ مرنے کے لیے جا رہا ہے۔ پھر انہوں نے بلایا تو اس نے کہا کہ جی اس طرح سے غلطی ہو گئی تو وہ کہنے لگے کہ اتنا بکھیڑا کیوں کیا ہے سیدھی طرح سے توبہ کر لو۔ ختم ہو گئی بات۔ وہ چلا گیا اور گاؤں میں جا کر بندے اکٹھے کیے اور جولاہے کو بلایا کہ بھئی جس طرح میں نے تجھے مارا تھا تو مجھے مار۔ اُس نے کہا کہ نہیں صاحب۔ پھر لوگوں نے بھی کہا کہ یہ کیسے ایسا کرے گا خیر اس کو چھوڑ دیا۔ تو پھر وہ جاگیردار جتنی دیر زندہ رہے صبح ان مولانا کے گھر جاتے اور بی بی نے جو سودا سلف منگوانا ہوتا وہ لا کر دیتے اور نوکر کی حیثیت سے کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور خود کام کیا۔ ایسے بے شمار بندے ہیں۔ ابھی بھی آپ کے شہر لاہور میں بھی بہت سے بندے ایسے جو گلی محلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں ہم ہی نہیں ملتے ان سے کیونکہ وہ ہمارے کام کے نہیں ہیں۔

س ـــــ تلاش بھی کریں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے!

اشفاق احمد ـــــ آپ تو ایسی بات نہ کریں، آپ تو ذہین آدمی ہیں۔ وہ اس لیے کہ تلاش ہے ہی نہیں۔ خدانخواستہ اس عمر میں اگر آپ کو کسی لڑکی سے محبت ہو جائے تو آپ آ کر مجھ سے نہیں پوچھیں گے کہ اشفاق صاحب! اچھا سا شیشہ کہاں سے ملا ہے وہ تو آپ لے چکے ہوں گے۔

س ـــــ کوئی پیمانہ بتائیں وگرنہ زیادہ تر لوگ تو روحانیت کے نام پر جعلی کاروبار کرتے ہیں ہر ایک پر شک پڑتا ہے۔

اشفاق احمد ـــــ جی ان سے نکلیں۔ بالکل۔ شاباش بہت اچھی یہ پہلی بات آپ نے جائز بات کی ہے کہ شکوک پڑتے ہیں اور اصل آدمی ملتے بھی نہیں بعد میں وہ جعلی نکل آتے ہیں لیکن ان جعلی آدمیوں کے اندر ہی آپ کو اصلی آدمی تلاش کرنا ہے۔

س ـــــ شہاب کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کا نظام صوفیاء کا نیٹ ورک چلاتا ہے آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

اشفاق احمد ـــــ میں اس بارے میں کچھ جانتا نہیں لیکن میں نے اس بارے میں بہت پڑھ رکھا ہے

بہت ممکن ہے کہ ایسا ہوتا ہو لیکن میں اس بات کا شاہد نہیں ہوں لیکن میں اس بات کا ماننے والا ہوں کہ ان کا ایک سسٹم ہوتا ہوگا۔

س۔۔۔۔ آپ جن لوگوں سے ملے ہیں کیا آپ نے خود کسی کی کرامات دیکھی ہیں۔

اشفاق احمد۔۔۔۔ میں کوئی تقریباً ساڑھے گیارہ صوفیوں سے ملا ہوں۔ گیارہ تو بہت طاقتور تھے جبکہ ایک جیسے آپ نے کہا کہ اچھا بولنا اور اچھی گفتگو کرنا۔ یہ بھی مجھے ملے اور بالکل خاموش رہنے والے بھی ملے جو کہ بہت کم بولتے تھے اور ایسے بھی ملے، منظور سندھی صاحب کے جب ان سے کوئی سوال کرتا تو وہ کہتے تھے کہ نہیں بھائی میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ جس بارے میں جانتے تھے اس کی بات کرتے تھے۔ میں ان لوگوں کو بہت قریب سے ملا ہوں اور میری حیرانی یہ ہے کہ انسان ہوتے ہوئے یہ مجھ سے کس طرح برتر ہیں حالانکہ تعلیم میں بی اے بھی نہیں تھے۔ لیکن وہ یہ سب کچھ کس طرح حاصل کرتے ہیں۔ یہ میرے لیے کوئی 13 برس تک تعجب کا باعث رہا اور میں چوری چھپے روزن دیوار میں سے کھڑکیوں میں سے دیکھتا رہا کہ ان کی کوئی چوری پکڑوں لیکن نہیں پکڑ سکا تو میں کہتا تھا کہ ان کو کوئی اور طرح کی تائید حاصل ہے۔ کوئی رہنمائی ہے، کرامت تو بڑی چھوٹی سی چیز ہے۔ کرامت تو شاید میرے جیسا چھوٹا سا بندہ بھی اگر فراغت ہو تو میں بھی کرامت دکھا دوں۔

س۔۔۔۔ کیا آپ کو خود ایسا کوئی روحانی تجربہ ہوا؟

اشفاق احمد۔۔۔۔ نہیں مجھے نہیں ہوا یہ بڑا اچھا سوال ہے۔ میری بڑی بدقسمتی ہے کہ کوئی ایسا روحانی تجربہ جو میں بیان کرسکوں اور جو قارئین کے کام آسکے میرے اوپر نہیں گزرا۔ لیکن میں اپنے دوستوں سے یہ سوال پوچھتا رہا ہوں اور بہت سے عام لوگوں کے ساتھ بھی واقعات پیش آجاتے ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں ایگریکلچر کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میں تو عام آدمی ہوں لیکن جب میں ایف اے کا طالب علم تھا تو ایک مرتبہ شرقپور میں اپنے گھر کے باہر چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک بیری تھی جہاں سے دھوپ آرہی تھی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ روشنی دھوپ کی روشنی نہیں تھی کچھ اور تھی پھر میں اس سے ڈرا بھی، وہ روشنی چمکتی ہوئی میری چارپائی تک بھی آتی تھی۔ میں نے کہا کہ بے وقوف آدمی وہ تجلی ہوتی ہے۔ وہ میرا ایک تجربہ ہے۔

س۔۔۔۔ قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے کہ ان کو رقعے آتے تھے اور عام تجربات سے ماورا ان کے تجربات تھے۔ آپ بھی ان کے بہت قریب رہے ہیں اور آپ ان کو مانتے بھی ہیں۔ ان کی یہ باتیں عام فہم نہیں ہیں۔ کسی اور ہی دنیا کی باتیں لگتی ہیں۔

اشفاق احمد ـــــــ دیکھیں ناں جس طرح آئن سٹائن کی تھیوری عام فہم نہیں ہے۔ لیکن لوگ اس کو مانتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ شہاب صاحب نے جتنی باتیں لکھی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔ وہ میرا تجربہ نہیں ہیں لیکن میں اس کورد نہیں کرسکتا۔ دیسی ملک میں مصیبت ہی یہی ہے کہ ایک دم سے کہہ دیتے ہیں کہ بکواس ہے جی۔ اگر آپ کسی گورے سائنسدان کے پاس جائیں اور اس سے یہ بات کریں تو وہ کہے گا کہ یہ میرا تجربہ تو نہیں ہے لیکن میں اس کا بطلان نہیں کرسکتا۔ اس کے ساتھ ضرور ایسا ہوا ہو گا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک تو معلوم کی دنیا ہے اور ایک لامعلوم کی دنیا ہے جس میں بہت سے سوالات پڑے ہوئے ہیں۔ جن کے جوابات ہم تک پہنچنا ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ لامعلوم کی دنیا سے ایک بندہ اٹھا نیوٹن کو بھی ایک رقعہ آیا اور اس نے کہا کہ ایک کشش ثقل ہے اور اس نے اس کے تین اُصول بھی بنا دیئے۔ چلتے چلتے آئن سٹائن نے کہا کہ نہیں یہ غلط ہیں۔ بوگس ہیں اور وہ غلط بھی ثابت ہو گئے۔ اگرچہ یہ میرا تجربہ نہیں ہے لیکن میں اس کا بطلان نہیں کرسکتا۔

س ـــــــ اشفاق صاحب آپ کا گڈریے سے لے کر ادب کا جو سفر ہے اس میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ گڈریے میں تو آپ ایک کلاسیکی ادیب لگتے ہیں جس کا انسانی جذبات کے ساتھ زیادہ تعلق ہے لیکن ''اور'' ڈراموں میں یا ''سفر در سفر'' میں معاشرتی حوالوں کا زیادہ ذکر ہے۔ یہ تبدیلی کیوں آئی؟

اشفاق احمد ـــــــ آپ مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ بچپن میں تو آپ تختی لکھتے تھے اور اب بال پین سے کیوں لکھنے لگے ہیں۔ یہ بنتا ہے ناں اس کا جواب۔

س ـــــــ نہیں میں اس کے اُلٹ بات کر رہا ہوں کہا جاتا ہے کہ گڈریے کا اشفاق آج کے اشفاق احمد سے زیادہ بڑا ادیب تھا اور وقت کے ساتھ آپ اپنی تحریروں کا معیار قائم نہیں رکھ سکے۔

اشفاق احمد ـــــــ بالکل ٹھیک کہتے ہیں وہ اس لئے کہ اس بات کا فیصلہ تو آنے والے نقاد کریں گے کہ گڈریے کا ادیب بڑا تھا یا اور ڈرامے کا۔ آج کا قاری یہ سمجھتا ہے کہ وہ بڑا تھا۔ وہ ایک جذباتی چیز تھی گڈریا لکھنے کے لیے میں تھوڑا سا شرمندہ بھی ہوں۔

س ـــــــ آپ گڈریا لکھنے پر شرمندہ کیوں ہیں۔ کیا آپ کو یہ نہیں لکھنا چاہیے تھا؟

اشفاق احمد ـــــــ میرا خیال ہے کہ مجھے گڈریا نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ اب معاشرتی مسائل مجھے زیادہ عزیز ہیں۔ انسان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن میرے ملک کے قاری کہتے ہیں کہ تم تبدیلی کیوں لائے؟ ویسے ہی لکھتے رہو جیسے ایم اسلم اور منٹو لکھتے تھے۔ دوسری قسم کی کہانیاں، ایسی تم بھی لکھتے رہو، منٹو نے تو ایکی

شرافت کی کہانیاں کبھی نہیں لکھی تھیں۔

س ـــــ لیکن سعادت حسن منٹو کی کہانی کا اثر بہت زیادہ تھا اور وہ اب بھی بہت پڑھی جاتی ہے۔

اشفاق احمد ـــــ ہاں بہت پڑھی جاتی ہیں۔ ابھی اور پڑھی جائیں گی، لیکن آہستہ آہستہ لوگ سوچ کی طرف مائل ہوں گے۔

س ـــــ تو کیا آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ منٹو کی ان کہانیوں میں سوچ اور فکر نہیں۔

اشفاق احمد ـــــ جی نہیں! وہ تو بڑی اچھی صحافیانہ کہانیاں ہیں۔ سوچ کا عنصر نہیں ہے وہ تو ایک واقعاتی بیان دے کر آپ کو ہلا دیتا ہے۔ منٹو کی کہانیوں کو دنیا کے دوسرے بڑے ادیبوں کے مقابلے میں نہیں دیکھا جاسکتا وہ تو بس لطف بھری کہانیاں ہیں جن کو قاری لطف کے لیے پڑھتا ہے۔ بہرکیف میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تبدیلی آنی چاہیے۔ آپ کہتے ہیں کہ رک کر بس گڈریے جیسی کہانی لکھی جائے۔ گڈریے جیسی کہانی بھی لکھی جانی چاہیے۔ لیکن اس کے آگے بھی میدان پڑا ہے آگے بھی لکھی جانی چاہیے۔

س ـــــ اشفاق احمد صاحب! آپ نے مشرق کی برتری اور مغرب پر تنقید کا جو سلسلہ شروع کیا ادب میں تو آپ کی پیروی ہوئی لیکن معاشرے پر آپ کی تحریروں کا کوئی اثر نہیں آتا۔ کیا آپ کی وجہ سے معاشرے میں کوئی تبدیلی آئی۔

اشفاق احمد ـــــ نہیں آئی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تحریروں سے معاشرے میں کوئی تبدیلی آئے کچھ ادیب بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ برطانوی ناول نگار چارلس مثلاً ڈکنز خوش نصیب تھا اس نے چائلڈ لیبر پر لکھا تو وہ اس کی زندگی میں ہی آہستہ آہستہ چائلڈ لیبر ختم ہونے لگی۔

س ـــــ آپ چائلڈ لیبر پر کیوں نہیں لکھتے؟

اشفاق احمد ـــــ میں چائلڈ لیبر سے بڑی چیزیں لکھ چکا ہوں جس میں اس سے بڑے مسائل پر لکھا ہے۔ جیسے ابھی آپ نے ''سفر در سفر'' کا ذکر کیا ہے۔ اس میں بڑی چھپی ہوئی چیزیں ہیں۔

س ـــــ ویسے تو آپ منٹو کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ اس کی کہانیوں میں فکر کی گہرائی نہیں ہے۔ لیکن اس ''سفر در سفر'' میں آپ نے بھی جنس کو موضوع بنایا ہے۔

اشفاق احمد ـــــ بہت، میں نے تو اس میں مچھلی کا سیکس بیان کیا ہے اور بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن چھوٹا منہ بڑی بات ہے کہ اس میں سے حاصل کرنے کا رخ اور ہے منٹو کی کہانیوں کا رخ اور ہے۔ آپ نے پڑھا ہی ہے۔ لیکن آپ کا یہ سوال اپنی جگہ پر قائم ہے۔ وہ تو کوئی خوش قسمت ادیب ہوتا ہے جس کو اللہ یہ عطا کر دیتا

ہے کہ اس کے لکھنے سے تبدیلی آئے۔ میں تو ایک پدا سا چھوٹا سا ادیب ہوں۔ جو کچھ بھی نہیں لیکن علامہ اقبال جیسا شاعر جو کہ میں سمجھتا ہوں کہ ان جیسا شاعر پچھلی صدی میں کوئی نہیں تھا اور شاید آگے بھی کوئی نہ ہو لیکن ان کا بھی معاشرے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

س ــــ نہیں! علامہ اقبال نے تو معاشرے کی قسمت بدل دی ان کی وجہ سے پاکستان بنا۔

اشفاق احمد ــــ نہیں نہیں وہ دیکھیں ناں کہ پاکستان تو علامہ اقبال کو رکھ کر قائداعظم کو نکال لیں اس میں سے تو پھر اس لٹریچر کے زور پر تو شاید نہ بن سکتا اس کے پیچھے تو ایک پورے عمل کی کہانی ہے۔ بندوں کے عمل کی بھی کہانی ہے۔ قائداعظم اور عام بندوں کو نکال کر صرف اقبال اور اس کی شاعری کو رہنے دیں تو صرف اس سے پاکستان بننا مشکل ہو جاتا ہے۔ اقبال کا پیغام جو پاکستان بننے کے بعد ہم پر طاری ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو سکا۔

س ــــ لیکن اقبال کے نظریات کا تو آپ کے نظریات سے تصادم ہے؟

اشفاق احمد ــــ بالکل ہے۔ لیکن ہونا چاہیے۔

س ــــ اقبال تو جمہوری ریاست کی بات کرتے ہیں۔

اشفاق احمد ــــ لیکن انہوں نے جمہوریت کے خلاف بھی تو 19 شعر لکھے ہیں۔

س ــــ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ دن کا اقبال اور ہے اور رات کا اقبال اور ہے۔

اشفاق احمد ــــ جی بالکل ٹھیک ہے۔ ان پر جو کیفیت ہوتی تھی وہ وہی لکھتے تھے۔ دن کو وہ لیکچر لکھتے تھے۔ وہ عقل کی چیزیں ہیں اور رات کو شاعری کرتے تھے۔

س ــــ تو کس کی زیادہ اہمیت ہے؟

اشفاق احمد ــــ آپ کس اقبال کے لیکچر پڑھتے ہیں جس نے شاعری کی تھی یا جو محمد اقبال ایک پروفیسر تھا؟ (طنزیہ انداز میں)

س ــــ ظاہر ہے پہلے تو ہر کوئی اقبال کو بطور شاعر جانتا ہے۔

اشفاق احمد ــــ ہاں اسی وجہ سے آپ ان کے لیکچروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ناں! اگر اس میں سے شاعری نکال لی جائے اور وہ اقبال نہ ہو صرف گورنمنٹ کالج کا پروفیسر ہو تو آپ اس کو اتنی اہمیت نہیں دیں گے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ وہ دانش سے لکھتے ہیں۔ تو جس طرح کیفیت ہوتی ہے اسی طرح کئی تبدیلیاں بھی آتی ہیں۔ وہ عظیم ادیب تھے اور دیکھیں ناں لوگ سمجھتے ہیں کہ ان میں بڑا تضاد ہے۔ کبھی وہ

تصوف کی بات کرتے ہیں اور کبھی ردھم کی۔ کبھی وہ معاف کرنے کی بات کرتے ہیں تو کبھی مخالف کو پڑ جانے کی۔ تو یہ تضاد کیوں ہے؟ تو یہ چیزیں بڑے ادیب پر ایسے ہی گزرتی ہیں۔ جیسے اقبال پر گزریں۔ تضاد زندگی کا راز ہے۔ جب آپ تضاد کو سمجھنے لگتے ہیں تو ایک عظیم مفکر بننے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

س ـــــ کیا آپ مذاہب کے ایک ہونے کے نظریئے کو مانتے ہیں Unity of Religion کے قائل ہیں۔

اشفاق احمد ـــــ بالکل کیونکہ اللہ کے بنائے ہوئے دین ہیں تو ان میں یونٹی تو ہے۔

س ـــــ کیا آپ بدھ مت سے بھی متاثر ہیں۔ مہاتما بدھ کی تصویر بھی آپ کے ڈرائنگ روم میں لٹک رہی ہے۔

اشفاق احمد ـــــ ہاں میں کافی متاثر ہوں لیکن جب میرے پاس اپنا دین موجود ہے تو پھر میں کسی دوسرے سے متاثر نہیں ہوتا۔

س ـــــ اشفاق صاحب! کہتے ہیں کہ آپ کے اندر منفی کردار بھی موجود ہے جو تلقین شاہ کے روپ میں باہر آیا، ممتاز مفتی اور آپ کے دوست جب آپ کا ذکر کرتے ہیں تو وہ تھوڑی سی آپ کی انا کا ذکر ضرور کرتے ہیں جو کہ تلقین شاہ میں بھی نظر آتی ہے۔

اشفاق احمد ـــــ پتہ نہیں یار۔ میری انا کا ذکر مفتی صاحب نے کیا تھا میں نے ان کا ایک بیان پڑھا تھا۔ پتہ نہیں ہو سکتا ہے ہو۔ میں تو جن دوستوں سے پوچھتا ہوں وہ تو کہتے ہیں کہ نہیں ہے لیکن کہیں ہوگی ضرور جس کو میں اپنے آپ پکڑ نہیں سکتا۔ میں اس کے بارے میں بہت پریشان ہوں۔ میں تو ڈیروں پر بھی جاتا رہا ہوں اور وہاں پر بڑی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔

س ـــــ کیا آپ قدرت اللہ شہاب کے ہاتھ پر بیعت ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ نہیں، وہ بیچارے بیعت تو نہیں کرتے تھے۔ وہ تو ماڈرن آئی سی ایس تھے۔ لیکن عبادت گزار بہت تھے۔ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھا، میں کئی مرتبہ ان کے پاس سوتا تھا وہ تہجد پڑھتے وقت لائٹ کے آگے اس طرح سے گتہ لگا دیتے تھے کہ میری طرف روشنی نہ پڑے۔ وہ تہجد کے بعد بڑے دردناک انداز میں فقیروں کی طرح خدا سے دُعا مانگتے تھے۔

س ـــــ لیکن بطور ایک بیوروکریٹ تو ان کا وہی سٹیریو ٹائپ رول تھا؟

اشفاق احمد ـــــ بالکل یہی سمجھ لیں۔ میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن لوگوں کا جو پڑھا ہے اس

سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے ہی تھے۔ نوکری ان کی ویسے ہی تھی۔

س ــــ ان کی نوکری میں ان کی مذہبی شخصیت اور روحانی کرامات کا کوئی عکس نظر نہیں آتا؟

اشفاق احمد ــــ (طنزیہ انداز میں) یہ نظر نہیں آتا کہ وہ دفتر میں میز کرسی کی بجائے صف بچھا کر بیٹھے ہوں یا استعفیٰ دے دیا ہو۔

س ــــ نہیں جناب بات یہ ہے کہ جب جنرل ایوب خان نے پریس ٹرسٹ بنایا اور اخبارات قبضے میں لیے تو قدرت اللہ شہاب کہاں تھے جو ان کو اس بارے میں مشورہ دیتے کہ ایسا نہ کریں؟

اشفاق احمد ــــ شاید دیا ہو۔ لیکن انہوں نے کہا ہو کہ میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔ اسی لیے تو وہ سفیر بن کر ہالینڈ چلے گئے تھے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ قاری کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ایسا ہو۔ یا کسی کے بارے میں یہ سوچا جاتا ہے کہ وہ اقتدار کے اتنا قریب رہا تو مربعے وغیرہ لیتا رہا۔ میرے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں جو تبدیلی آئی ہے مذہب وغیرہ کی تو یہ ضیاء الحق کے دَور میں آئی اور یہ ایک ڈرامہ لکھتا تھا تو اس کو ایک مربعہ زمین ملتی تھی۔

س ــــ لیکن آپ کی سوچ میں تبدیلی تو ضیاء الحق کے زمانے میں ہی آئی۔

اشفاق احمد ــــ میری سوچ گڈریے کے زمانے میں ہی تبدیل ہو گئی تھی۔ میرے سارے افسانے جو کہ ضیاء الحق سے پہلے کے ہیں وہ لوگوں کو پڑھنے پڑیں گے پھر وہ طے کریں گے لیکن آسان تو یہی بات ہے ناں کہ ایسے ہی کہہ دیا جائے کہ وہ جی میں نے دیکھا وہ تو اس طرح سے ہے۔ چور پکڑنا بہت آسان ہوتا ہے۔ میری سوچ میں بہت پہلے تبدیلی آئی اور میں لکھتا رہا۔

س ــــ لیکن اشفاق صاحب! دیکھیں ناں تضاد ہے ناں اب دیکھیں ناں نظام بہتر ہے جمہوریت کا اور اس وقت ایک آمر کی حکومت تھی۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر یہ نہ لکھا ہو لیکن آپ کے ڈراموں سے بالواسطہ طور پر یہ پیغام ملا کہ آمریت جمہوریت سے بہتر ہے۔

اشفاق احمد ــــ یہ سچ مچ حسن اتفاق ہے لیکن یہ اتنا پکا ہو گیا کہ میری تحریریں ضیاء الحق کو تقویت دینے کے لیے ہیں اور اس کے جواب میں مجھے سرگودھا میں ایک مربع ملتا ہے۔ (مزاحیہ انداز میں) اس لحاظ سے وہاں پر میرے کوئی 126 مربعے ہیں۔ میں نے تو بھٹو صاحب کے زمانے میں بھی ایسے ہی ڈرامے لکھے۔

س ــــ عام طور پر تاثر یہ ہے کہ آپ نے بھٹو کے زمانے میں ان کی حمایت میں ڈرامے لکھے۔

اشفاق احمد ــــ وہ مجھے ضرور نکال کر دکھائیں۔ کہ لکھا ہوا ہے جمہوریت کے بارے میں۔

س ــــ جب آپ فیض احمد فیض کی تعریف کرتے ہیں اور اس کو صوفی قرار دیتے ہیں بائیں بازو کی تعریف کرتے تھے بعد میں آپ تبدیل ہو گئے۔

اشفاق احمد ــــ لاحول ولاقوۃ: کیا ایسا میں بھٹو سے ڈر کر کرتا ہوں۔

س ــــ نہیں ایک نظریہ تو تھا ناں سوشلسٹ نظریہ۔ آپ اس کے حمایتی تھے پھر آپ ضیاء الحق سے مل گئے۔

اشفاق احمد ــــ (غصے سے) ٹھیک ہے پھر میں تو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر یہاں تک کی سوچ ہے تو ٹھیک ہے۔

س ــــ اچھا سر ہم بات انا اور منفی رویئے کی کر رہے تھے؟

اشفاق احمد ــــ اس کا مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ مفتی صاحب تو ملنگ آدمی تھے۔ جب لاہور میں آتے تو ہمارے ہاں ہی ٹھہرتے تھے۔ انہوں نے کبھی ترنگ میں کہہ دیا ہوگا۔ کبھی میں ان کے سامنے سے تیزی سے گزر گیا ہوں گا یا سلام نہیں کیا ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے کوئی بات ہو بھی۔

س ــــ اچھا سر ہمارے معاشرے کا ہیرو اب ادیب یا دانشور کیوں نہیں ہے؟ ہمارا ہیرو کھلاڑی اور فلمی ہیرو کیوں ہے؟

اشفاق احمد ــــ دیکھئے اب سارا کچھ الیکٹرانک میڈیا کے حوالے ہے تو اس کے حوالے سے جو لوگ ہوں گے وہی معروف ٹھہریں گے ناں۔ اقبال پرنٹ میڈیا کے آدمی تھے لیکن اب الیکٹرانک میڈیا زیادہ طاقتور ہو گیا ہے تو یہاں پر تو جو بندے سامنے آتے ہیں وہی ہوں گے ناں۔ پھر اب سوچ کے لیے بھی لوگ تیار نہیں ہیں۔ اب ساری دنیا میں ایسا ہی ہے کہ سوچ کے لوگ سکڑتے جا رہے ہیں۔

س ــــ پاکستان میں کلچر کے بارے میں دو آراء پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارا کلچر وہی ہے جو اس خطے کا کلچر ہے جو موہنجوداڑو سے شروع ہوتا ہے اور آج تک آتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں ہمارا کلچر اسلامی کلچر ہے جو برصغیر کے دوسرے کلچر سے مختلف ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

اشفاق احمد ــــ میں ایسے لوگوں میں شامل ہوں جو کہتے ہیں کہ ہمارا کلچر، اسلامی کلچر ہے۔ جب میں مسلمان ہو گیا تو میرا کلچر وہ نہیں رہا۔ کیونکہ موہنجوداڑو کا کلچر تو بادشاہ پرستی ہے۔ لیکن اسلام کلچر اس سے بالکل مختلف ہے۔ آج جو ڈاکٹر مبشر حسن اور عاصمہ جہانگیر کہتی ہیں کہ ہمارا کلچر انسانیت ہے تو دراصل انسانیت تو ایک ایسا ڈھکوسلا ہے جس میں بہت آسانی ہے۔

اگر آج آپ انسانیت کے قائل ہو جائیں تو آپ کو اتنی چھوٹیں ملیں گی کہ بتا نہیں سکتا۔

کلچر کے بارے میں ایک چھوٹی سی بات ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا وہ ننگا تھا اور کچے جانور وغیرہ کھاتا تھا۔ اس نے اپنی ذات سے 5 سوال کیے۔ پہلا سوال کیا کہ میں کون ہوں، کدھر سے آیا ہوں اور کیا ہوں۔ پھر وہ کہتا تھا کہ یہ سمندر، آسمان اور مظاہر فطرت کیا ہے۔ پھر یہ کہ موت کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ موت کے بعد کیا ہوگا۔ ان پانچ سوالوں کے بعد معاملہ آگے بڑھنے لگا تو جن لوگوں نے ان پانچ سوالوں کے ایک جیسے جواب نکالے ہیں ان کا کلچر ایک ہے اور جنہوں نے مختلف نکالے ہیں ان کا کلچر مختلف ہے۔ اسی لیے ہم انڈیا والوں سے کہتے ہیں کہ آپ بہت اچھے ہیں، آپ کا کلچر بہت اچھا ہے۔ لیکن ہم سے مختلف ہے۔ میں جتنی بھی انگریزی پڑھ لوں یا مادی ترقی کر لوں میرا کلچر انگریزوں کے ساتھ نہیں مل سکتا۔

س ـــــ کیا پاکستان اور بھارت کے مذاکرات ہونے چاہئیں؟

اشفاق احمد ـــــ جی ضرور ہونے چاہئیں۔ یہ تو ہمیں شریعت کا بھی حکم ہے۔ پڑوسیوں کے ساتھ اچھی بات کرنے کا حکم ہے۔ مذاکرات ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن ان کو بتانا چاہیے کہ بھائی آپ کا اور ہمارا کلچر مختلف ہے یہ نہیں کہ آپ کہیں کہ آپ کا اور ہمارا کلچر ایک ہے اس لیے اکٹھے ہو جائیں۔ آپ طرز بود و باش کو کلچر کہنے لگ گئے ہیں۔ حالانکہ کلچر تو اس سے بہت بڑی چیز ہے۔

س ـــــ کشمیر کے مسئلہ کا کیا حل ہونا چاہیے؟

اشفاق احمد ـــــ وہی جو اقوام متحدہ کی قراردادیں ہیں۔

س ـــــ وہ قراردادیں پرانی نہیں ہوگئیں؟

اشفاق احمد ـــــ آپ تو کل مجھے کہیں گے کہ اشفاق صاحب آپ کی شادی کو 50 سال ہو گئے ہیں پرانی نہیں ہوگئی آپ نکاح نامہ پھاڑ دیں اور ایک اور عورت لے آئیں۔ (قہقہے)

س ـــــ لیکن اگر دونوں فریق ہی نکاح نامہ پھاڑنے پر تیار ہوں یا قراردادوں کو نظر انداز کرنے پر تیار ہوں تو۔

اشفاق احمد ـــــ جی بسم اللہ! ہم تو شروع سے یہی کہتے ہیں کہ دونوں طرف سے عوام کو پوچھیں کہ بھئی آپ کیا چاہتے ہیں پھر وہ جو کہیں اس کے مطابق حل کر دیں۔ اگر وہ پاکستان پر کانٹا لگاتے ہیں تو لگا دیں اور اگر وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں تو پھر بھی ہو جائیں۔

س ـــــ آپ خود مختار کشمیر کے حق میں نہیں ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ خود مختار کشمیر کے حق میں، میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہوا تھا تو پھر اب وہ پرچی دے دیں اور وہاں کے عوام کی رائے لے لیں۔

س۔۔۔۔۔۔۔۔اچھا سر! نواز شریف کے دور کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔۔۔۔اب میں اس بارے میں کیا کہوں۔ سیاستدانوں کے چونکہ میں قریب نہیں رہا تو کیا کہوں (طنزیہ انداز میں) بڑے اچھے لوگ ہوتے ہیں۔

س۔۔۔۔۔۔۔۔سر جو ادیب ہوتا ہے اس کا فقرہ یا جملہ لوگوں کے ذہنوں پر طاری ہو جاتا ہے۔ اگر آپ ان پر تبصرہ نہیں کریں گے تو کون کرے گا بالآخر یہ ہمارے حکمران ہیں اور ہمیں ان کے بارے میں کسی رائے کا اظہار تو کرنا چاہیے۔

اشفاق احمد۔۔۔۔۔۔۔۔حکمران تو ہمارے بن جاتے ہیں۔ ہم سے پوچھے بغیر۔ نواز شریف بڑا ہیوی مینڈیٹ لے کر آئے تھے۔ لیکن وہ ہیوی مینڈیٹ کہاں تھا اگر ہوتا تو وہ لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھتے۔

س۔۔۔۔۔۔۔۔فوج کا کوئی سیاسی کردار ہونا چاہیے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔۔۔۔ہرگز نہیں۔ فوج کا صرف وہی کردار ہونا چاہیے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے۔

س۔۔۔۔۔۔۔۔نواز شریف بھی تو فوج کا کردار محدود ہی کرنا چاہتے تھے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔۔۔۔دیکھیے نواز شریف کا اس طرح سے روکنا کہ فوج کا کردار نہیں ہونا چاہیے بالکل ٹھیک ہے۔ 12 اکتوبر کا فعل کوئی اچھا فعل نہیں ہے لیکن چونکہ آپ نے اس کو مان لیا۔ آپ کی عدلیہ نے اس کو مان لیا صحافت نے مان لیا تو پھر ہم نے بھی مان لیا۔

س۔۔۔۔۔۔۔۔دل سے نہیں مانا؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔۔۔۔نہیں ڈر کے مارے مانا یا جمہوریت سے مانا۔ ہم سے کوئی پوچھ کر تو کوئی نہیں کرتا۔ اب یہ صدر بنے ہیں تو ہم سے پوچھ کر بنے ہیں یا کل کو یہ اعلان کر دیں کہ میں شہنشاہ ہوں اور میرا نام جارج پنجم ہے تو کر دیں۔ میں تو یہی کر سکتا ہوں کہ لمبے لمبے کالم لکھ دوں کہ آہا آہا دیکھا پھر جس کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے تھے۔ (قہقہے) ہم تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں۔

س۔۔۔۔۔۔۔۔نواز شریف کی ناکامی کی کیا وجہ تھی؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔۔۔۔نواز شریف کی ناکامی کی وجہ میں یہ سمجھتا ہوں جو میں آپ سے بھی کہہ رہا تھا کہ لوگ جو جاہل ہیں یا جو بقول آپ کے پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے اچھے یا بُرے میں برکت رکھ دی ہے۔ یہ میں تصوف کی بات کر رہا ہوں۔ جو شخص گروہ انسانی کے قریب جائے گا اس کو مقناطیسی قوت سے طاقت ملے گی جس سے اس کی کمزوریاں دور ہونے لگیں گی۔ نواز شریف سے ہم یہ کہتے تھے کہ اے

بھائی تجھ کو اپنے بندے کے پاس جانا چاہیے اور مل کر ان سے بات کرنی چاہیے۔ یہ مت کہنا کہ کیونکہ وہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں اس لیے جب پڑھ لکھ جائیں گے تو پھر ملیں گے۔ مجھے کوئٹہ والوں نے کہا کہ آپ کا نواز شریف ہر وقت پنجاب میں ہی گھسا رہتا ہے۔ حالانکہ ہم نے کوئٹہ میں اس کے لیے کرکٹ گراؤنڈ بھی بنائی ہے۔ تو مہینے میں ایک مرتبہ وہ یہاں بھی آئیں۔ لیکن وہ نہیں گئے۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ یہ محل نما وزیراعظم ہاؤس چھوڑ دیں۔

س ـــــ آپ نے یہ تجویز دی تھی؟

اشفاق احمد ـــــ جی بالکل دی تھی اور اس پر بہت لمبی چوڑی بحث ہوئی جس میں یہ طے ہوا کہ اس پر سو روپیہ ٹکٹ لگا دیں گے۔ نواز شریف کہنے لگے کہ آپ میرے رہنے کے لیے جگہ تلاش کریں۔ ہم نے ایک کوٹھی بھی دیکھی اور وہ مان گئے۔ میں بہت خوش ہوا کہ چلو ادیب کی بات مانی گئی تو شام کو اس کے بندے آئے کہ سر وہاں پر تو سکیورٹی کا مسئلہ بن جائے گا وغیرہ وغیرہ تو ایسا انہوں نے پلٹا کھایا کہ میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

س ـــــ کیا کبھی بھٹو سے ملاقات ہوئی؟

اشفاق احمد ـــــ جی ایک بار ہوئی۔ بھٹو صاحب ایک پڑھا لکھا ولایت زدہ آدمی تھا اس کی سوچ زمینی نہیں تھی ہاورڈ کی تھی۔ جیسی کہ اس کی بیٹی کی ہے۔

س ـــــ بیٹی بے نظیر کے بارے میں تو آپ پہلے کہتے تھے کہ بے نظیر میں کچھ صوفیانہ خصوصیات موجود ہیں؟ کیا اب آپ کے نظریات بدل گئے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ ہاں پہلے میں سمجھتا تھا کیونکہ وہ تسبیح پھیرتی رہتی تھیں لیکن اب پتہ چلا کہ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ بھٹو صاحب میں ایک طاقت تھی اور ہم لوگوں نے میٹنگ میں ڈر کر بات کی۔ پاکستان کو ایک حکمران بھی ایسا نہیں ملا جو کہ پاکستانی ہو۔ چودھری محمد علی جیسا آدمی جو کہ بہت ایماندار شخص تھا لیکن چونکہ ان کی تربیت ہی ولایتی ہوئی ہے اس لیے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔

س ـــــ ضیاء الحق کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اشفاق احمد ـــــ ضیاء الحق بیچارے تو آمریت کے آدمی تھے اور اپنے آپ کو انہوں نے برسر اقتدار رکھنا تھا۔ وہ تو تین ماہ کے لیے آئے تھے۔

س ـــــ کیا وہ جھوٹ بولتے تھے؟

اشفاق احمد ــــ جھوٹ نہیں بولتے تھے لیکن ان کا ہر فعل جھوٹ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ ایسا وہ جان بوجھ کر اور سوچ کر نہیں کرتے تھے۔ ان کے اندر سے ہی یہ بات اٹھتی رہتی تھی۔ انہوں نے کبھی بدنیتی سے کوئی ایسا کام نہیں کیا لیکن وقت کا تقاضا ہی ایسا تھا۔

س ــــ کیا بھٹو کی پھانسی ٹھیک تھی؟

اشفاق احمد ــــ میں اس بارے میں کیا کہوں لیکن بقول میری بیوی کے یہ ٹھیک نہیں تھی۔ میں تو پھانسی کے ویسے بھی زیادہ حق میں نہیں ہوں۔

س ــــ سر کیا یہاں پر اسلامی قانون کا نفاذ ہوسکتا ہے اور لوگوں کو اسلامی سزائیں دی جانی چاہئیں؟

اشفاق احمد ــــ اسلامی سزائیں تو پھر آپ کو ڈھونڈنا پڑیں گی۔ یہ تو فقہی سزائیں ہیں جو فقہ میں مقرر کر دی گئیں۔ اسلام کی جب آپ سزائیں ڈھونڈنے بیٹھیں گے تو بڑا مشکل ہے۔ کہ آپ کو سزائیں ملیں۔

س ــــ کیا یہ دو مختلف باتیں ہیں؟

اشفاق احمد ــــ جی میں سمجھتا ہوں۔ حالانکہ میں اس کا ماہر نہیں ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کیونکہ اسلام میں بہت معافی اور بہت پردہ پوشی ہے اور تاریخ اسلام میں تو مجھے قید خانے بھی نظر نہیں آتے کہ نبی کریمؐ کے زمانے میں قید خانہ کہاں تھا۔ جہاں پر بندے بند کر دیئے جاتے۔ ابھی تک تو مجھے نظر نہیں آیا۔ میں اس لیے اس کو فرق فرق سمجھتا ہوں کہ اسلام چونکہ رحمت العالمین کا مذہب ہے اس لیے اس میں سزاؤں کی اتنی خوفناک شکل نہیں ہوسکتی اور جو قرآن میں سورہ نور میں فرما دیا گیا ہے۔ رجم کا یہ درے لگانے کا تو وہ ٹھیک ہے۔ اس کی تفسیر نکالی جائے کہ درہ کیا ہوتا ہے اور کیسے مارا جائے کیونکہ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ درہ مسواک جتنا چھوٹا ہوتا ہے۔ اب جو اسلام نظر آ رہا جو کہ میرا اور آپ کا اسلام ہے، وہ اس لیے کہ روز صبح اخبارات میں چھپتا ہے کہ بیوی کو غلط فہمی میں یا قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر کلہاڑا مار کر ہلاک کر دیا۔

س ــــ تو کیا غیرت کے مسئلہ پر قتل نہیں ہونا چاہیے؟

اشفاق احمد ــــ نہیں توبہ توبہ یہ تو ہندو راجپوت اور برہمن کرتے ہیں۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں تو لوگ شک پر ہی ذبح کر دیتے ہیں۔

س ــــ لیکن اس موضوع پر تو آپ نے کبھی نہیں لکھا؟

اشفاق احمد ــــ یہ میرا موضوع نہیں رہا۔ آپ روز تو قتل دیکھتے ہیں۔

س ــــ روز قتل ہوتے ہیں۔ اتنا بڑا موضوع ہے اور ہیومن رائٹس والے تو کہتے ہیں کہ اس پر کام ہو۔

اشفاق احمد ـــــــ ہیومن رائٹس والے تو اپنی بے ایمانی سے بات کرتے ہیں۔ ان کا تو اپنا ملک ہے، این جی اوز ہیں، پیسہ ہے، ان کا مافیا ہے ان کا تو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کو تو کوئی اچھی بات بھی چونکہ اسلام کی ہے ان کو پھر پیسہ ملنا بند ہو جائے گا۔ دیکھیں ناں! وہ تو کہتے ہیں کہ تم یہ کہو کہ پاکستان میں عورتوں پر بہت ظلم ہو رہے ہیں۔ پھر ہم تمہیں پیسہ دیں گے۔ نہیں تو بند ہو جائے گا۔

س ـــــ اشفاق صاحب! مسلمانوں میں جو ملوکیت ہے وہ کیوں نہیں جا رہی؟

اشفاق احمد ـــــــ اصل میں ملوکیت کا چسکا ہی ایسا ہوتا ہے خاندانوں کو کہ یہ کہیں سے بھی نہیں جا رہی (تمسخر اڑاتے ہوئے) یہ انگلستان سے نہیں جا رہی، بیلجیئم سے نہیں جا رہی، ہالینڈ سے نہیں جا رہی، ڈنمارک سے نہیں جا رہی، ناروے سے نہیں جا رہی، سویڈن سے نہیں جا رہی۔

س ـــــ وہاں کی بادشاہتیں تو علامتیں ہیں۔

اشفاق احمد ـــــــ علامتی کیوں ہیں بھئی اور بھی بہت سے ملک ہیں جہاں پر بادشاہ بیٹھے ہوئے ہیں اور ٹکٹ انہی کا چھپ رہا ہے۔ کیوں بھئی۔ تم تو بڑے روشن خیال بندے ہو اس کو بند کر دو کہ وہ جی وہ تو علامتی ہے (طنز کرتے ہوئے) اے پیارے تھرڈ ورلڈ کے لوگو وہ تو علامتی ہے تمہاری جو بادشاہت ہے وہ گندی ہے (سنجیدہ انداز میں) یہاں سے ملوکیت اس لیے نہیں جا رہی کہ نیتیں اچھی نہیں ہیں۔ ملوکیت تو میرے آپ سے نہیں جا رہی۔ جس بات کا آپ بار بار ذکر کر رہے تھے کہ مسلمان کا رذلت میں ڈوبے ہوئے ہیں، گندے ہیں، کیوں ہیں۔ اشفاق صاحب مسئلہ بیان کیجیے۔ تو آپ کے مسلک کا مسئلہ یہ ہے اگر آپ کو حل کرنے کا شوق ہو کہ مساوات آپ کی بنیاد ہے۔ جس معاشرے میں مساوات نہ ہو وہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔ ہمارا ایک تو دین کا یہ اصول ہے۔ مساوات کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ یا تو سارے کے سارے امیر ہو جائیں اور یا پھر سارے کے سارے غریب ہو جائیں پھر ہی چل سکے گا نا۔ اب سارے کے ساروں کا امیر ہونا تو ناممکن بات ہے اور سارے کے ساروں کو پکڑ کر غریب کرنا جیسے کے انقلابات آتے رہے ہیں وہ بھی کامیاب نہیں ہوتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے ملک کا امیر طبقہ وہ اپنا سامان، کار اور فرنیچر باہر جا کر گند پر نہ پھینک دے بلکہ اس کی نمائش کو بند کر دے اور جس طرح سے پرانے ہندو یا آپ کے میمن اور بوہرے اب بھی رہتے ہیں کروڑ پتی، اس طرح کی زندگی بسر کرنی شروع کر دیں۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا تو یہ بات رک نہیں سکے گی۔

س ـــــ تو کیا ہمارے معاشرے میں انقلاب آ جائے گا؟ آپ مستقبل میں کیا دیکھتے ہیں۔

اشفاق احمد ــــــ پاکستان میں انقلاب تو شاید نہ آئے یہاں کے لوگ بڑے شریف ہیں۔ بیچارے انقلاب نہیں آنے دیں گے لیکن انارکی کا ڈر لگتا ہے اور اگر انقلاب آیا بھی تو کامیاب نہیں ہوگا۔ آج تک کوئی انقلاب کامیاب نہیں ہوا آپ صرف ایک فرانس کی مثال دے سکتے ہیں۔ لیکن وہ بھی اس طرح سے نہیں تھا۔ انقلاب سے فائدہ نہیں ہوتا۔ اس لیے پیغمبر انقلاب نہیں لائے۔

س ــــ اشفاق صاحب! پاکستان کی موجودہ شاعری کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

اشفاق احمد ــــــ پاکستان کی موجودہ شاعری، غزل کی شاعری ہے۔ خاص طور پر مضافات کے شاعر بہت اچھی غزلیں لکھ رہے ہیں۔

س ــــ تو کیا غزل لکھنی چاہیے یا نظم؟

اشفاق احمد ــــــ ہمارے ہاں تو غزل کی روایت ہے اور وہی لکھی جا رہی ہے۔ نظم لکھنے کا ہمارے ہاں یارا نہیں۔ جیسی نظم مغرب میں لکھی گئی ہے ویسی نظم ہمارے ہاں لکھی نہیں جا سکی۔ ایسی نظمیں لکھی جانی چاہئیں جن کا کوئی مقصد ہو۔ نظم میں بہت سی طاقتور بات کہی جا سکتی ہے جیسے کہ ن۔ م راشد صاحب نے شروع کیا تھا مجید امجد ہمارا نظم کا بہت بڑا شاعر ہے۔ فیض احمد فیض کی بھی نظمیں اپنی جگہ پر بہت اچھی طاقتور اور موضوع ہیں لیکن جیسی نظمیں 19 ویں صدی میں شیلے اور کیٹس وغیرہ نے لکھی تھی یا بعد میں ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ نے لکھی تھیں ہمارے ہاں اس کی داغ بیل ڈالی نہیں جا سکی۔ ن۔ م راشد نے کوشش کی اور ان کے ساتھ ترقی پسند شاعروں نے بھی کچھ کوشش کی لیکن ان کا مسلک کچھ الگ سا تھا۔

س ــــ کیا آپ ان سے اتفاق نہیں کرتے۔۔۔؟

اشفاق احمد ــــــ نہیں ان کا ایک طے شدہ نظریہ تھا۔

س ــــ آپ اس کی پیروی نہیں کرتے؟

اشفاق احمد ــــــ میں اس لیے نہیں کرتا کہ ادب برائے زندگی ہونا چاہیے۔

س ــــ ترقی پسند تحریک بھی یہی کہتی ہے؟

اشفاق احمد ــــــ ہاں ترقی پسند تحریک کے جتنے بھی لکھنے والے تھے وہ عملاً ادب برائے ادب کے قائل تھے اور صرف زبانی طور پر ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ ان کو جو رہنمائی ملتی وہ اس کے مطابق لکھتے تھے وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ زندگی کو دیکھ کر کچھ لکھیں۔

س ــــ اشفاق صاحب! کیا جنات موجود ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ جناب ضرور موجود ہیں۔

س ـــــ کیا آپ نے خود دیکھے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ میں نے دیکھے تو نہیں لیکن میری ان میں دلچسپی بہت رہی ہے اور جن لوگوں نے دیکھے ہیں ان سے میں نے ضرور پوچھا ہے میرے ساتھ کسی جن کا ایسا واسطہ تعلق تو نہیں ہوا لیکن بالواسطہ میں نے ان کو تھوڑا سا جانا ہے۔ خاص طور پر یہ کہ وہ مختلف جگہوں پر رہتے ہیں شہروں میں، ویرانوں میں، جنوں کی سٹڈی بڑی دلچسپ سٹڈی ہے وہ آپ میں سے کسی کو کرنی چاہیے جرنلسٹ احباب کو بھی کہ یہ کیا ہے ولایت والے تو بہت کرتے ہیں۔

س ـــــ سر، کہتے ہیں کہ اسلام میں تو ڈرامہ لکھنے اور سٹیج کرنے کی روایت ہی نہیں ہے اور آپ یہ اسلام کے متضاد کام کر رہے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ اسلام میں تو اسپرو دکھانے کی بھی اجازت نہیں ہے تو میں تو یہ گولی کھاتا ہوں بہت ساری چیزوں کی اجازت نہیں ہے لیکن میں وہ کرتا ہوں اور میں اس کے لیے شرمندہ ہوں واقعی ڈرامے کی اجازت نہیں ہے اس کے علاوہ قرآن پاک میں سورۃ شعراء ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے شاعروں کو پسند نہیں کیا اور ایسے لکھنے والوں کو جو ایسی بات کہتے ہیں جس پر عمل نہیں کرتے۔ بڑی خوفناک ہے اس معاملے میں آپ کا سوال بالکل ٹھیک ہے میں ایک غیر اسلامی فعل کر رہا ہوں اور بھی کئی سارے ایسے ہیں مثلاً سود لیتا ہوں میری تو تنخواہ ہی سود سے آتی ہے اس لیے 23 سال کا سود کھایا اب بھی ایک سودی معاشرے میں رہتا ہوں جس کے لیے بڑا سخت حکم ہے تو بہت ساری ایسی چیزیں ہیں اب کیا کریں۔

س ـــــ سر کچھ عرصہ قبل احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض کے حوالے سے جو بحث چلی ہے تو اگر آپ کو ان دونوں کی گریڈنگ کرنا پڑے تو کیسے کریں گے؟

اشفاق احمد ـــــ دیکھیں بھئی گریڈنگ کرنا تو خاصا مشکل کام ہے یہاں تو مرثیہ نگاری میں انیس اور دبیر کا موازنہ ہوتا رہا ہے اپنی اپنی جگہ پر دونوں اچھے ادیب ہیں اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ شاعری کے معاملے میں فیض بہت رومانٹک ہیں اور لکھنے کے معاملے میں قاسمی صاحب الفاظ کو آگے لے جانے کی کوشش کرتے ہیں گو کہ اتنا خیال انگیز نہیں ہوتا۔

س ـــــ یعنی قاسمی صاحب خیال انگیزی میں فیض سے کم ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ فیض بھی خیال انگیزی میں کم ہی تھے لیکن ان کی شاعری میں الفاظ کا چناؤ اور رومانیت

بہت زیادہ ہے فیض کی شاعری میں بھی فکر کم ہے جیسے اقبال ایک گرے پڑے آدمی کو آگے لے کر جاتے ہیں اس طرح کی چیز نہیں ہے ان میں۔

س ـــــ عالی صاحب نے کہا ہے کہ آپ اقبال کو قومی شاعر نہیں کہہ سکتے!

اشفاق احمد ـــــ تو کیا کہہ سکتے ہیں؟

س ـــــ جمیل الدین عالی صاحب کا کہنا ہے کہ وہ تو طوائف کا گانا بھی سنتے تھے ان کو آپ قومی یا اسلامی شاعر نہیں کہہ سکتے۔

اشفاق احمد ـــــ کیا قومی شاعر وہ ہوتا ہے جو گانا نہ سنے، ریڈیو نہ سنے، ٹی وی نہ دیکھے، کمال ہے، بہت حیران کن بات کی، اگر عالی نے یہ بات کی ہے تو بڑی نالائقی کی بات کی ہے مجھے اس سے ایسی توقع نہیں تھی شاید کچھ اور بات کہنا چاہتا ہو اور یہ کہہ گیا ہو اگر وہ قومی شاعر نہیں ہے تو پھر تو ـــــ اگر آپ نے پوچھنا ہو کہ کیا اقبال ملی شاعر ہے تو ایران سے جا کر پوچھیں۔

س ـــــ حبیب جالب نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اشفاق صاحب ریڈیو کے ایک اچھے آرٹسٹ ہیں بس اس سے زیادہ نہیں تو آپ کی اس پر کیا رائے ہے؟

اشفاق احمد ـــــ اچھا کہا تھا اس نے (حیرانی سے) ان سے میری بڑی پرانی محبت تھی ہم جب پانچ چھ سال کے تھے تو ہماری دوستی ہم اکٹھے مچھلی پکڑتے تھے پھر پاکستان بن گیا تو ہم یہاں آ گئے، میرے بھائی نے انہیں ایئر فورس میں بھرتی کرا دیا پھر وہ چھوڑ آئے۔ حبیب جالب کے والد بہت اچھے خوش خط تھے، میں نے اس سے لکھنا سیکھا۔ پھر میں ان کو ریڈیو لے گیا وہ بہت پیارے آدمی تھے ہمارے تو ان کے ساتھ خاندانی مراسم تھے تو ٹھیک ہے کہا ہو گا بلکہ میں تو اس کا بطلان کرتا ہوں کہ میں تو ریڈیو کے بھی قابل نہیں ہوں لیکن ان معنوں میں انہوں نے کوئی خاص اچھی بات نہیں کی کہ ریڈیو کا براڈ کاسٹر ہونا تو بڑی بات ہے۔

س ـــــ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اشفاق صاحب کی ملا کے ساتھ ہمدردی تو قابل فہم ہے لیکن وہ ملا ازم کے حق میں نہیں ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ بالکل ٹھیک کہا تھا میں بالکل ملا ازم کے حق میں نہیں ہوں ہمدردی کے لیے میں اپنے سربراہ جنرل مشرف کو کہہ رہا تھا کہ ان سے ملیں لیکن میں ان کی حکمرانی ہرگز نہیں چاہتا۔ ہمارے مذہب میں تو پاپائیت ہے ہی نہیں گہری سے گہری ملا ازم میں ایسی نہیں ہے یہ تو لوگ ایسے ہی مثالیں دیتے ہیں۔ میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ ملا سے ملوان کو بے شک عزت بھی نہ دیں۔

س ـــــ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پہلے آپ بڑے روشن خیال تھے تو یہ تبدیلی ہوئی کیسے؟

اشفاق احمد ـــــ پتہ نہیں میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس وجہ سے ہوئی کہ میں انسانیت سے نکلا اور اسلام کی

طرف آیا۔

س۔۔۔۔۔ اچھا سر! آپ اپنی سالگرہ کیوں نہیں مناتے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ (ہنستے ہوئے) میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں وہ میری انا کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

س۔۔۔۔۔ وہ کیسے۔۔۔؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ (ہنستے ہوئے) یہ میں الٹا آپ سے سوال کر رہا ہوں ناں، میں نے تو آج تک اپنی کسی کتاب کی تقریب نہیں کی، اپنی کسی کتاب کا فلیپ نہیں لکھا۔ منٹو نے زبردستی میری پہلی کتاب پر فلیپ لکھا۔

س۔۔۔۔۔ آپ کی بیگم بانو قدسیہ بھی بہت بڑی ادیبہ ہیں تو حسد تو محسوس کرتے ہوں گے آپ؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ میں کرتا ہوں وہ نہیں کرتیں کیونکہ راجہ گدھ کے بعد تو میں بہت چھوٹا ہو گیا ہوں اتنا بڑا ناول تو اُردو میں کوئی بھی نہیں لکھ سکا میں کیا چیز ہوں زیادہ تو نہیں لیکن کبھی کبھار تھوڑا سا محسوس ہوتا ہے پھر میں کہتا ہوں کہ چلو ایک ہی گھر کو یہ نیک نامی یا شہرت ہے۔ لیکن ہلکی سی تکلیف ہوتی ہے کہ وہ مجھ سے بڑی ادیبہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے۔

س۔۔۔۔۔ کیا آپ کی شادی محبت کی شادی تھی؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ ہم دراصل کلاس فیلو تھے تو آپ محبت کی کہہ سکتے ہیں بلکہ یہ محبت کی نہیں لڑائی کی شادی تھی یہ کنیئرڈ کالج سے آئی تھی ریاضی کی طالبہ تھی اور کہتی تھی کہ میں نے ایم اے اُردو کرنا ہے پطرس بخاری صاحب ہمارے انہوں نے اس کو داخل کر لیا اس کو اُردو لکھنا نہیں آتی تھی یہ ہمدردی کو ہمدرری لکھتی تھی تو اس نے بڑی کوشش کی میں امتحان میں اول آتا تھا اس نے دن رات لگا کر پڑھائی کی اور 5th ایئر کے امتحان میں مجھے مات دے دی پھر وہ ایک چل سی ہو جاتی ہے جو آہستہ آہستہ محبت کا رخ کر لیتی ہے۔

س۔۔۔۔۔ آپ کو تاریخ کا کونسا کردار پسند ہے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ تاریخ کے بہت سے کردار پسند ہیں اور ان میں زیادہ تر صوفیاء کے ہی کردار ہیں۔ مثلاً خواجہ بختیار کاکی، حضرت نظام الدین اولیاء، خواجہ غلام فرید، اس کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیز انہوں نے اس تھیوری کو غلط کر دیا جو صحافی کہتے ہیں کہ اگر اوپر کا بندہ نیک ہوا اچھا ہو تو نیچے والے ٹھیک ہو جائیں گے لیکن ان کے معاملے میں نیچے والوں نے نیک آدمی کو قتل کر دیا۔

س۔۔۔۔۔ پنجاب دوسرے صوبوں کا استحصال کیوں کرتا ہے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ پنجاب دوسرے صوبوں کا استحصال بالکل نہیں کرتا میں یقین سے کہتا ہوں پنجاب جتنا چاہے استحصال کر لے کوئی اس کو برا نہیں سمجھ سکتا لیکن پنجاب میں ایک بہت بڑی خرابی ہے کہ پنجاب اکثریتی صوبہ ہے صحت مند لوگ ہیں شکل وصورت کے بھی اچھے ہیں ان میں تعلیم دوسرے صوبوں کے

مقابلے میں زیادہ ہے اس چیز نے پنجاب میں ایک تکبر سا پیدا کر دیا ہے۔ پنجاب ہر دس سال بعد بڑی اونچی آواز میں للکار کر دوسرے صوبوں سے کہتا ہے کہ آؤ ہم سب بھائی ہیں۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر منزل کی طرف چلیں دوسرے صوبے اس کی بات مان لیتے ہیں اور وہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگتے ہیں آٹھ دس قدم چلنے کے بعد پنجاب میں اضطراب شروع ہو جاتا ہے وہ پہلے ایک بازو چھڑواتا ہے پھر دوسرا چھڑواتا ہے اور جلدی قدم اٹھانے لگتا ہے۔ پھر کوئی 30 قدم چل کر پیچھے دیکھتا ہے اور آواز لگاتا ہے کہ یار جلدی چلو تمہاری ٹانگوں کو کیا ہوا ہے۔ شاباش ہے تم تو بالکل نکمے ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ جا ہماری جان چھوڑ۔ یہ خرابی ہے اس میں، استحصال نہیں کرتا اپنے پاس سے دیتا ہے بجلی، پانی ان کو دیا ہوا ہے اگر یہاں کالاباغ ڈیم بننے لگتا ہے تو ڈرتا ہے اور نہیں بنا تا لیکن اس کا تکبر جو کہ کچھ واضح ہے اور کچھ چھپا ہوا ہے اس کے خلاف آپ کو جہاد کرنا ہے اور دوسرے صوبوں کو بتانا ہے کہ یہ برا نہیں ہے یہ تو آپ کو پانی بھی دے دیتا ہے دوسری چیزیں بھی دیتا ہے لیکن اس کا رویہ گندہ ہے۔

س ـــــ قیام پاکستان سے لے کر آج تک سب سے زیادہ دُکھ کس بات پر ہوتا ہے؟

اشفاق احمد ـــــ سب سے زیادہ دُکھ تو ملک ٹوٹنے پر ہوتا ہے 16 دسمبر پر یعنی جس دن مشرقی پاکستان الگ ہوا۔

س ـــــ یہ کس کی غلطی تھی؟

اشفاق احمد ـــــ غلطی تو ہم سب کی تھی میری اور جسیم الدین دونوں کی اور مشرقی پاکستان کی اور مغربی پاکستان دونوں کی غلطی تھی۔

س ـــــ کیا کوئی شعبہ ایسا ہے جس پر آپ کو اطمینان بھی ہو؟

اشفاق احمد ـــــ ہم نے بہت سے شعبوں میں ترقی کی ہے۔ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں بڑی ترقی کی ہے۔

س ـــــ اشفاق صاحب آپ کے ادیب بننے میں آپ کے خاندانی پس منظر نے کام کیا یا ذاتی روش نے؟

اشفاق احمد ـــــ یہ میری ذاتی کوشش ہے میرے خاندانی پس منظر نے تو کچھ نہیں کیا نہ ہی میری مدد کی نہ مجھے ایم این اے کروایا ہاں البتہ یہ کہتے رہے کہ واہ جی واہ ہم اشفاق صاحب کے چچا ہیں۔ مدد نہیں، کہ میں اپنی محنت میں لگا رہا میں نے ثابت قدمی کے ساتھ جو کام مجھے دیا گیا پورا کیا اور لیت ولعل نہیں کیا آج کا کام کل پر بالکل نہیں ڈالا اس میں، میں اپنی ریڈیو کی ملازمت کا شکر گزار ہوں کیونکہ ریڈیو میں یہ ہوتا ہے کہ آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر یہ پروگرام جانا ہے تو وہ جانتے ہیں میں تو سب سے کہتا ہوں کہ اپنے کام میں سستی نہ کریں اور اس معاملے میں ولایتی لوگ ہم سے بہت آگے ہیں۔

س ـــــ بڑا ادیب بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

اشفاق احمد ـــــ یہ سوال میں نے شکاگو میں نیلسن آرمن سے پوچھا تھا وہ میرا بڑا پسندیدہ ادیب تھا اس

نے کہا کہ کرسی پر جم کر بیٹھنے سے یعنی محنت سے ہی فائدہ ہوتا ہے۔

س ـــــ کیا اس میں جینئیس یا ذہانت شامل نہیں ہے؟

اشفاق احمد ـــــ جینئیس تو شامل ہے لیکن جینئیس تو کئی ہیں لیکن وہ بڑے ادیب نہیں بن سکے۔

س ـــــ کیا آپ پیری مریدی کے قائل ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ بالکل، بہت قائل ہوں۔

س ـــــ کیا کسی کی بیعت کی؟

اشفاق احمد ـــــ نہیں اس طرح سے نہیں کہ میرے جو مرشد تھے حضرت سائیں فضل شاہ صاحب ان کی بیعت کا طریقہ بڑا عجیب تھا وہ اپنے مرید کو وضو کرواتے تھے جب وضو مکمل ہو گیا تو بیعت ہو گئی اس پر بڑی شرم آتی تھی کہ اتنے بڑے بزرگ آپ کو وضو کروا رہے ہیں تو میں اس طرح سے ان کا بیعت ہوں اور وہ میری نظر میں بہت بڑے آدمی تھے وہ ویسے تو ان پڑھ تھے لیکن روحانی طور پر بہت طاقتور تھے اور ان کے پاس بہت کچھ تھا۔

میں اس لیے بھی بڑا قائل ہوں کہ جب میرا بچہ بیمار ہوتا ہے تو میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں کل بھی میرا ایک بھانجا کہہ رہا تھا کہ پیری مریدی شرک ہے، تو میں نے اسے کہا کہ میں کیا کروں جب میرا بچہ بیمار ہوتا ہے تو میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہوں یہ بھی شرک ہے مجھے براہ راست اللہ سے کہنا چاہیے کہ اس کو ٹھیک کر دے جب میرا مقدمہ ہو تو میں وکیل کے پاس جاتا ہوں یہ بھی شرک ہے تو شرک تو یہاں قدم قدم پر ہے پیری مریدی میں یہ فائدہ ہے کہ اس سے آدمی تکبر اور انا سے نکلتا ہے کیونکہ بندے کو ماننا پڑتا ہے۔

س ـــــ کیا کبھی استخارہ کیا؟

اشفاق احمد ـــــ استخارہ نہیں کیا اب میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ جم کر استخارہ کروں۔

س ـــــ سر کبھی روتے بھی ہیں آپ؟

اشفاق احمد ـــــ ہاں بہت اب بڑھاپے میں تو بہت زیادہ آنے لگا ہے مثلاً کبھی فارسی نعت سن کر روتا ہوں۔

س ـــــ پسندیدہ گلوکارہ کون ہے؟

اشفاق احمد ـــــ پسندیدہ گلوکارہ تو ہماری میڈم نور جہاں ہی تھی۔

س ـــــ مناظر فطرت میں کیا پسند ہے؟

اشفاق احمد ـــــ مناظر فطرت میں مجھے صحرا اچھا لگتا ہے۔

س ـــــ کیوں۔۔۔۔؟

اشفاق احمد ـــــ اس لیے کہ صحرا میں ایک وسعت ہوتی ہے اس کے علاوہ میرا ایک تاثر بھی ہے کہ صحرا پیغمبر پیدا کرتے ہیں، پہاڑ اور غار وغیرہ ولی اللہ پیدا کرتے ہیں۔ صحرا کی وسعت پیغمبر پیدا کرتا ہے یہ میرا اپنا فلسفہ ہے چنانچہ مجھے جب کبھی بھی موقع ملتا ہے میں تھرپارکر میں جا کر رہتا ہوں۔

س ـــــ زندگی کا مشکل ترین مرحلہ کب آیا؟

اشفاق احمد ـــــ ایسے مواقع کئی دفعہ آئے ہیں چھوٹے چھوٹے مقام پر مثلاً پاکستان نیا نیا بنا تھا اور ہم ٹی ہاؤس میں بیٹھے تھے سارے سوشلسٹ دوست تو وہاں پر کھدر کے کپڑے پہنے ایک آدمی آیا کہ میری جیب کٹ گئی ہے اور مجھے فیصل آباد جانا ہے اس کو سوا دو روپے چاہئیں تھے میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ دیکھو تو وہ سب کہنے لگے کہ یہ حکومت کو چاہیے کہ بندوبست کرے یہاں کب تک ایسے ظلم ہوتا رہے گا سب نے تقریریں شروع کر دیں تو میرے پاس دو روپے چار آنے نہیں تھے اور میں تڑپ رہا تھا میں وہ پیسے نہیں دے سکا تو اس طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات بہت ہوتے رہے ہیں جو میں کبھی اپنے معمار میں لکھوں گا۔

س ـــــ بیرونی دنیا میں کونسی جگہ پسند آئی؟

اشفاق احمد ـــــ میں کافی دیر روم میں رہا اس لیے اٹلی روم ہی پسند ہے وہاں کی صبح شامیں، گانے سب پسند ہیں۔

س ـــــ لیکن روم نے تو آپ کو بدل دیا؟

اشفاق احمد ـــــ جی میرا خیال ہے لیکن مجھے پسند ہے۔

س ـــــ آپ اُردو سائنس بورڈ میں کب گئے؟

اشفاق احمد ـــــ 1965ء میں جنگ سے ذرا سا پہلے میں پہلے ریڈیو میں سکرپٹ رائٹر تھا پھر یہاں آ گیا 60 سال میں ریٹائرمنٹ لے لی۔ ہم نے اپنے وسائل سے بلڈنگ بنائی بڑی محنت کی اور اتنی خوبصورت عمارت بنائی بس ایک لگن تھی زندگی ساری اس طرح کا کام ہے۔

س ـــــ مستقبل کے آپ کے کیا پلان ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ کچھ بھی نہیں اب آخری عمر ہے۔

س ـــــ آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

اشفاق احمد ـــــ 26 اگست ہے۔

س ـــــ کیا اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ جی بہت، بہت اب کسی انعام کی خواہش نہیں ہے مجھے میری قوم نے اتنا دیا ہے کہ میں اس کا حقدار نہیں تھا سرکاری طور پر کچھ نہیں ملا۔

س ـــــ کیا دیا ہے؟

لڑاکی سی ہے لیکن عام آدمی نے بہت عزت دی

اشفاق احمد ــــــ داد، حالانکہ ہماری قوم بے چاری سی ہے بھی جانا جاتا ہوں۔ جمیل الدین عالی کی وہاں رادھارام میں وہ ادیب ہوں جو ایک دوسرے انگ سے

میں وہ ادیب ہوں جو ایک دوسرے انگ سے بھی جانا جاتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ گیا وہ وہاں کا نواب ہے اس کے وہاں بڑے زمینیں ہیں ایک دن وہ مجھے وہاں لے گیا۔ میں اس کے ساتھ گیا وہ وہاں کا نواب ہے اس کے وہاں بڑے

زمینیں ہیں ایک دن وہ مجھے وہاں لے گیا۔ یہاں تم میرے ساتھ اوئے توئے نہ کرنا جب ہم وہاں پہنچے تو مربعے ہیں اس نے کہا کہ یہ میرا علاقہ ہے یہاں تم میرے ساتھ اوئے توئے نہ کرنا جب ہم وہاں پہنچے تو

مربعے ہیں اس نے کہا کہ یہ میرا علاقہ ہے بھی شامل تھا وہ آ گیا تو مجھے کہنے لگا کہ کہیں آپ تلقین بندے سارے اکٹھے ہوگئے تو ان میں ایک سکول ماسٹر بھی شامل تھا وہ آ گیا تو مجھے کہنے لگا کہ کہیں آپ تلقین

بندے سارے اکٹھے ہوگئے تو ان میں ایک سکول ماسٹر بھی شامل تھا وہ آ گیا تو مجھے کہنے لگا کہ کہیں آپ تلقین شاہ تو نہیں میں نے کہا کہ ہاں بس پھر کیا تھا اس نے کہا کہ اوئے ہمارے گاؤں میں تلقین شاہ آ گیا ہے

شاہ تو نہیں میں نے کہا کہ ہاں بس پھر کیا تھا اس نے کہا کہ اوئے ہمارے گاؤں میں تلقین شاہ آ گیا ہے نواب تو پتہ نہیں کہاں رہ گئے وہ سارا گاؤں میرے ساتھ لگ گیا اور سب کہنے لگے کہ روٹی ہمارے ساتھ

نواب تو پتہ نہیں کہاں رہ گئے وہ سارا گاؤں میرے ساتھ لگ گیا اور سب کہنے لگے کہ روٹی ہمارے ساتھ کھائیں میں نے کہا کہ اتنی روٹی تو میں نہیں کھا سکتا تم ایسا کرو کہ گڑ کی ایک ایک ڈلی لے آؤ وہ سارے گئے

کھائیں میں نے کہا کہ اتنی روٹی تو میں نہیں کھا سکتا تم ایسا کرو کہ گڑ کی ایک ایک ڈلی لے آؤ وہ سارے گئے اور اپنے اپنے گھر سے گڑ لے آئے میں نے وہ سوغات رومال میں باندھ لی عالی کہنے لگے کہ تم مخولی کا کام

اور اپنے اپنے گھر سے گڑ لے آئے میں نے وہ سوغات رومال میں باندھ لی عالی کہنے لگے کہ تم مخولی کا کام کرتے ہوناں اس لیے یہ لوگ سارے اکٹھے ہوگئے ہیں وہ لوگ سارے اکٹھے ہوگئے اور میری موٹر ہی نہ

کرتے ہوناں اس لیے یہ لوگ سارے اکٹھے ہوگئے ہیں وہ لوگ سارے اکٹھے ہوگئے اور میری موٹر ہی نہ چھوڑیں پھر انہوں نے کہا کہ آپ گاڑی سٹارٹ نہ کریں ہم اپنے گاؤں سے اس کو دھکیل کر نکالیں گے پکی

چھوڑیں پھر انہوں نے کہا کہ آپ گاڑی سٹارٹ نہ کریں ہم اپنے گاؤں سے اس کو دھکیل کر نکالیں گے پکی سڑک پر جا کر آپ سٹارٹ کرلیں اب میں ان کو کیسے انکار کروں۔

س ــــــ تلقین شاہ زیادہ مشہور ہے یا اشفاق احمد؟

اشفاق احمد ــــــ پہلے تلقین شاہ زیادہ مشہور تھا، پھر اشفاق احمد ہوا۔ اب ایک اور چالاک آدمی مشہور ہے، صوفی صاحب!

س ــــــ آپ کو ان میں سے کون پسند ہے؟

اشفاق احمد ــــــ مجھے تو سارے ہی پسند ہیں۔ ان سے نیک نامی ہوتی ہے اور عزت ملتی ہے۔ لیکن میں صوفی نہیں بن سکا۔ صوفی کی سطح زمین سے تھوڑی اونچی ہوتی ہے۔ میں تو گلیوں میں چلنے والا آدمی ہوں۔ کاش میں ایسا ہوسکوں اور مرنے سے پہلے دو دن بھی ایسے مل جائیں تو بڑی خوشی کی بات ہوگی۔

س ــــــ ملک کے لیے آپ کیا سوچتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔

اشفاق احمد ــــــ ملک کے لیے ہی تو ہر وقت سوچتا ہوں، بلکہ یو ایس آئی ایس والے تو کہتے ہیں کہ یہ پاکستان کا ماما آرہا ہے۔ انہوں نے تو میرا نام ہی پاکستان کا ماما رکھ دیا ہے، اس بات نے بڑی تکلیف پہنچائی ہے کہ ہم نے جس مقصد کے لیے ملک بنایا تھا اسے حاصل نہیں کرسکے۔ ہمارے حکمران بھی بے ایمان ہیں اور زمین پر بیٹھ کر پھل بیچنے والا بھی۔ دونوں کی سطح ایک ہی ہے۔ دُکھ اس بات کا ہے کہ ہم نے قائداعظم کے بہ قول پاکستان ایک نمونہ بنایا تھا۔ میری ایک آرزو ہے کہ نیوزی لینڈ کی کوئی ماں یا نانی اپنے پوتوں سے یہ کہے کہ اس مرتبہ تم اپنی چھٹیاں پاکستان میں گزارنا۔ وہ دنیا میں ایک ایسا ملک ہے جو سب سے نرالا ہے

اور جہاں انسانوں کی بڑی قدر ہے۔ تم وہ دیکھ کر آنا کہ کیسا ہے۔

س ــــ آپ ملک کے ممتاز دانش ور ہیں۔ توہین رسالتؐ کے بارے میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک تو علمائے کرام کا ہے کہ یہ قانون ہونا چاہیے اور دوسرا یہ کہ اس قانون سے معصوم اور بے گناہ لوگ بھی پھنس جاتے ہیں اور اس سے ایسی گنجائش پیدا ہو رہی ہے جس سے اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ آپ کا کیا موقف ہے؟

اشفاق احمد ــــ میرا اس بارے میں تیسرا موقف ہے۔ میں توہین رسالتؐ کے قانون کے بالکل حق میں نہیں ہوں۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ نعوذ باللہ خدانہ خواستہ اگر کوئی توہین رسالت کا مرتکب ہو تو یہ ذمہ داری پھر میری ہے کہ میں اس سے نمٹوں۔ یہ حکومت کا کام ہرگز نہیں ہے کیونکہ یہ تو معاذ اللہ میرے رسولؐ کی توہین کا معاملہ ہے یہ تو بہت آرام طلبی ہے اور اپنی ذمہ داری سے نظریں چرانا ہے کہ حکومت اس کا بدلہ لے۔ میں اس کا بدلہ لوں گا۔ میں غازی علم دین ہوں، قانون نہیں بنایا جا سکتا اور جب بنا بھی تھا تو میں بہت شرمندہ ہوا تھا کہ کیا ہم اتنے کمزور ہو گئے ہیں؟ کیا اب غازی علم دین ہمیشہ کے لیے پیدا ہونا بند ہو جائے گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک تو قدرتی محبت ہوتی ہے جو اپنی اولاد، ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ہوتی ہے اور ایک محبت اکتسابی ہوتی ہے جس کو صرف ایک مسلمان ہی سمجھ سکتا ہے۔ محبت وہ ہوتی ہے جو ہمیں اپنے رسولؐ کے ساتھ ہے۔ وہ رشتے اور جذبات کی محبت نہیں لیکن اس اکتسابی محبت کا جذبہ ملاحظہ فرمائیے کہ آپ کی جذباتی محبت کا علم بردار اور آپ کے دل کے قریب رہنے والا آپ کا بیٹا اگر آپ کی اکتسابی محبت کی توہین کرتا ہے تو آپ ہاتھ میں تلوار لے کر اس کی گردن اڑا سکتے ہیں۔ یہ کمال کی حقیقتیں ہیں۔ (انٹرویو: سہیل وڑائچ، جنگ سنڈے میگزین 18 نومبر 2001ء)

☆☆☆

''ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے''

س ــــــ آپ نے پہلا افسانہ کب لکھا؟

اشفاق احمد ــــــ میں نے 1942ء میں پہلا افسانہ لکھا تھا اس کا نام ''توبہ'' تھا اور وہ ''ادبی دنیا'' میں چھپا۔ مولانا صلاح الدین نے اپنے ایڈیٹوریل میں اس کی بڑی تعریف کی۔ میں چھوٹا سا آدمی تھا۔ لیکن اس سے مجھے بڑا حوصلہ ہوا۔

س ــــــ اس زمانے میں آپ کا سیاسی شعور کیسا تھا؟

اشفاق احمد ــــــ اس زمانے میں ہماری ایک بہت طاقتور جماعت تھی ''ترقی پسند تحریک'' وہ کسی بندے کو بندہ ہی نہیں سمجھتی تھی۔ جو اس کے اصولوں سے مطابقت نہ رکھتے ہوں ایسے لوگوں کو چاہے وہ کیسے ہی ادیب ہوں کان سے پکڑ کر نکال دیتی تھی کہ یہ تو ادیب ہی نہیں ہے۔ جیسے ممتاز مفتی کے ساتھ ہوا، قدرت اللہ صاحب تھے، نسیم حجازی تھے۔

پاکستان بننے کے ساتھ ہم چند لڑکے پوری طاقت کے ساتھ نکلے جن میں انتظار حسین، اے حمید اور استاد دامن بھی تھے، اے حمید کی دوستی تو امرتسر کے کچھ ترقی پسند دوستوں کے ساتھ تھی لیکن ان کی تحریر میں وہ ساری باتیں نہیں آئی تھیں جو ترقی پسند تحریک کا تقاضا تھیں۔ یہی معاملہ انتظار حسین کے ساتھ اور خود میرے ساتھ بھی تھا۔

ہماری سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہم اپنی طاقت کے زور پر چلے۔

س ــــــ اپنی بال کے سیکی؟

اشفاق احمد ــــــ بالکل آپ نے صحیح الفاظ چنے، ہم نے اپنی بال کے سیکی، اپنے قارئین پیدا کر کے اپنی زندگی کی شمعیں جلا کر روشنی کی۔ یہ بڑا ہی مشکل کام تھا۔ اس وجہ سے وہ ہمیں پسند نہیں کرتے تھے، من نکلا

لگاتے تھے کہ یہ نالائق روایت کے مارے ہوئے ہیں لیکن قارئین نے ہمیں جس طرح سراہا اس مہربانی سے
ہم زندہ ہے۔

س ـــــ آپ اپنی زندگی کا سفر ریڈیو پاکستان کے حوالے سے بتائیے؟

ج ـــــ میرا ایم اے کا رزلٹ ابھی نہیں آیا تھا کہ ہمارے ساتھی ممتاز مفتی، یوسف ظفر یہاں آئے اور کہا کہ ہم تو آج کل آزاد کشمیر ریڈیو میں کام کرتے ہیں اور انڈیا کے پراپیگنڈے کا توڑ کرتے ہیں ہمارے اسٹیشن ڈائریکٹر محمود نظامی بھی یہاں آئے ہوئے ہیں تم بھی ان سے ملو۔

ہم شام کو انہیں ملے تو انہوں نے کہا چھوڑ دو یہاں جو بھی کر رہے ہو چلو ہمارے پاس وہ مجھے وہاں لے گئے تین سو روپے مہینہ، بڑا اچھا ماحول، بڑے اچھے دوست، مسعود قریشی، وقار صدیقی، عمر، یہ پڑھے لکھے لوگ تھے سوان کے ساتھ میں نے بھی وہاں کام شروع کر دیا۔

پروفیسر عابد علی عابد دیال سنگھ کالج کے پرنسپل تھے وہ وہاں کسی ٹاک کے سلسلے میں گئے۔ میرا ایم اے اُردو کا رزلٹ آ چکا تھا، انہوں نے مجھے دیکھا تو بولے ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہمیں اُردو کے لوگ نہیں مل رہے'' میں نے کہا 'جی یہاں بہت اچھا ہے۔'' کہنے لگے ''نہیں غلط بات ہے، تم ایک استاد ہو چلو ہمارے ساتھ'' اس طرح یہاں لاہور آ کر دیال سنگھ کالج پڑھانا شروع کر دیا۔ میاں ریحان یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے ساری زندگی کبھی کسی نوکری کے لیے عرضی نہیں دی۔

س ـــــ اس کے باوجود بائیسویں گریڈ میں بھی پہنچ گئے؟

اشفاق احمد ـــــ یہ اللہ کے کام ہیں آپ دیکھ لیں۔ یہاں آیا تو بڑے بڑے نابغہ روزگار لوگ سٹاف روم میں بیٹھے ہوئے تھے انجم رومانی موجود تھے۔ یہاں آ کر پڑھائی کی طرف مزید رخ بدلا انگریزی کی طرف بھی رجحان ہوا۔ لائبریری، دیال سنگھ کی بہت اچھی تھی۔

اس طرح ڈیڑھ سال گزر گیا تو اس دوران اٹلی حکومت نے ہماری گورنمنٹ کو لکھا کہ ہم روم میں یونیورسٹی کے لیے اُردو کا استاد چاہتے ہیں جو ساتھ ہی ہمارے ریڈیو پر اُردو کی براڈ کاسٹ بھی کرے۔ یعنی ایک ہی شخص میں یہ دونوں باتیں ہونی چاہئیں سو اس لحاظ سے میں ایک ہی تھا جو یہ دونوں کام کر چکا تھا۔ سو مجھے روم بھیج دیا گیا۔۔۔ صبح یونیورسٹی شام ریڈیو۔ میرے لیے سن اکاون باون میں یہ ایک بڑا دلچسپ تجربہ تھا۔ ایک نوجوان آدمی بحیثیت پروفیسر وہاں کے بڑے بڑے لوگوں کو پڑھا رہا ہے بڑے قابل لوگوں سے میل جول ہوا۔ کئی اٹالین جو پاکستان سے ٹریڈ کے لیے اُردو پڑھ رہے تھے۔ کئی تھے فارن سروس میں آنا

چاہ رہے تھے، وہاں فارسی کے ایک پروفیسر ملے جو تھے تو اٹالین لیکن انہوں نے علامہ اقبال کی کتاب ''جاوید نامہ'' کا ترجمہ کیا تھا۔ عربی میں بھی وہ بڑے قابل تھے قرآن شریف کا انہوں نے اٹالین میں ترجمہ کیا۔ میرا وہ تجربہ بڑے کمال کا تھا۔ چھٹیوں میں مَیں نے سیر کرتے ہوئے سوئٹزرلینڈ، فرانس اور زیادہ وقت انگلستان گزارا کیونکہ وہاں ہمارے دوست اعجاز بٹالوی بیرسٹری کر رہے تھے ڈاکٹر جاوید اقبال بھی وہیں پر تھے۔

س ـــــ پھر تو آپ کی بڑی محفلیں جمتی ہوں گی؟

اشفاق احمد ـــــ بڑی لمبی چوڑی محفلیں، دلچسپ باتیں، ایک سکھ لڑکا کہنے لگا کہ یہ آپ کیا اُردو کی چیز ہے آپ لوگ لکھتے ''خواب'' ہیں پڑھتے ''خاب'' ہیں لکھتے ''خواہش'' ہیں پڑھتے ''خاہش'' ہیں یہ ''و'' کو کیا ہو جاتا ہے۔ اعجاز اسے سمجھا رہے تھے کہ ''و'' کہاں جا کر ساکن ہو جاتی ہے، کیسے آواز دیتی ہے۔ وہ لڑکا وہاں کئی سالوں سے بیرسٹری کر رہا تھا لیکن یہ بات نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے بڑے دلچسپ انداز میں اسے کہا سنو یہ جو ''و'' ہے یہ کہتی ہے میں نے نہیں بولنا اس کا بولنے والا مزاج ہی نہیں ہے یہ ناراض ہو جاتی ہے میں جاوید کا وہ انداز آج تک نہیں بھولا ہوں جب انہوں نے کہا کہ ''بھائی جب ''و'' نہیں بولتی ہے تو بس نہیں بولتی ہے تمہیں کیا''۔

س ـــــ جاوید صاحب کیا تب بھی ایسے ہی کھلے ڈھلے تھے؟

اشفاق احمد ـــــ ہاں ہاں تب تو وہ اس سے بھی زیادہ کھلے ڈھلے تھے۔ بہت ینگ، میموں میں، صاحبوں میں، بڑے پاپولر۔۔۔

س ـــــ باپ کا ایڈوانٹیج کیا وہاں بھی انہیں تھا؟

اشفاق احمد ـــــ بہت کم، کہیں کہیں، لیکن وہ اپنے بل بوتے پر ہی کافی تھے ان کا تھیس وہاں بڑا پاپولر ہوا تھا مضامین بھی یہ لکھتے رہتے تھے۔

س ـــــ ان کا موضوع کیا تھا؟

اشفاق احمد ـــــ ان کا موضوع تو فلاسفی تھا لیکن انہوں نے اسلام پر بھی وہاں ایک کتاب لکھی۔ اس طرح کی محفلیں ہوتی تھیں بی بی سی کے علی نقی بڑے دلچسپ آدمی ہوتے تھے۔

س ـــــ نوعمری میں آپ کو اقبال سے لگاؤ رہا؟

اشفاق احمد ـــــ ہاں ان کے فوت ہونے پر ہم نے سکھوں سے مل کر جلوس نکالا بہت لمبا چوڑا جلوس، بہت

روتے ہوئے، تب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اگر میں لاہور یا ارد گرد ہوتا تو شاید ملنے کا خواہشمند بھی ہوتا۔

س ــــــ کبھی جناح صاحب کو دیکھا؟

اشفاق احمد ــــــ 1942ء میں جب جناح صاحب جالندھر آئے تو مجھے بڑا شوق ہوا انہیں دیکھنے کا۔ میں فیروز پور میں ہوتا تھا سو ٹرین پر بیٹھ کر سخت سردی میں جالندھر گیا بڑا ہجوم تھا۔ وہاں ان کی آواز بڑی عجیب و غریب اور پر وقار لگی۔ پھر جب پاکستان بنا تو ہمارا ایک قافلہ روتے پیٹتے لاہور پہنچا۔ جس میں میرے کنبے کے لوگ تھے، ہم مزنگ روڈ پر ٹھہرے۔ میں نے بی اے کر رکھا تھا سو ایمپلائمنٹ کے آفس میں گیا انہوں نے تعلیم پوچھی تو کہنے لگے کہ اس معیار کی نوکری ہمارے پاس نہیں ہے پھر تیسرے دن گیا تو تعلیم میٹرک بتادی سو انہوں نے کہا بطور کلرک کہاں نوکری کرو گے۔ ریلوے میں، محکمہ فوڈ میں یا رفیوجی کیمپ میں؟ میں نے کہا رفیوجی کیمپ میں۔ سو انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ والٹن کے رفیوجی کیمپ میں گیا تو وہاں کیمپ انچارج تھے رانا صاحب انہوں نے کہا کہ بڑا سمارٹ سالڑکا ہے۔ انہوں نے 65 روپے ماہوار پر مجھے وہاں رکھ لیا۔ کوئی پندرہ دن گذرے تو ہمارے سپرنٹنڈنٹ نے کہا یہ تو کوئی افسر لگتا ہے باتیں بڑی اچھی کرتا ہے اسے اناؤنسمنٹ پر رکھ لیتے ہیں۔ جس میں لوگوں کا حوصلہ بڑھانے والی باتیں کرنے کی بھی تاکید تھی سو میں یہ کام کرنے لگا۔ پھر ایک اور صاحب بھی اس کام کے لیے لائے گئے ان کا نام تھا ممتاز مفتی، میں وہاں کلرک تھا۔ اس لیے جھجکوں لیکن چونکہ ان کا نام بطور رائٹر بھی جانتا تھا اور چاہتا تھا کہ میں انہیں بتاؤں کہ میں نے بھی کچھ افسانے لکھے ہیں پھر خواجہ نواب محمد شفیع دھلوی مقرر کر دیئے گئے یہ ان سے بھی بڑے افسانہ نگار تھے تب میں ڈرتے ہوئے ممتاز مفتی صاحب سے ملا تو وہ بڑی اپنائیت سے ملے۔ وہاں چونکہ مختلف ریجنل آفس بنے ہوئے تھے اس لیے ہم اپنے اپنے بوتھ پر کام کر رہے تھے۔ لیکن باہمی ربط سے ایک واسطہ بن گیا۔ اس کیمپ میں بُو بہت تھی میں نے بُو سے بچنے کے لیے اپنے کمرے کو کافی حد تک کاغذوں سے بند کر رکھا تھا۔ ایک دن لنگر سے میں روٹی لے کر مڑ ہی رہا تھا کے سامنے میں نے جس لمبے قد کے آدمی کو دیکھا تو آپ یہ سمجھیں کہ روٹی میرے ہاتھوں سے گر گئی کیونکہ وہ قائداعظم تھے۔ بہت غمگین۔ پوچھنے لگے کہ یہاں روٹی کیسی ہوتی ہے۔ میں نے عرض کی کہ جی بہت اچھی ہے کہنے لگے کھا کر دکھاؤ پھر میں نے تھوڑی سی کھائی۔ میرا جی چاہا کہ ان سے عرض کروں ہمارے کمرے میں چلیں لیکن مجھے حوصلہ نہ پڑا۔ بس یہ ہے وہ ملاقات جس کا شرف مجھے رفیوجی کیمپ میں حاصل ہوا جب میں نے واپس آ کر نواب شفیع صاحب کو اس کا احوال سنایا تو وہ رونے لگے پھر وہ روٹی مفتی صاحب نے کھائی، نہ

س۔۔۔۔ کسی جلسے میں مہاتما گاندھی کو دیکھا یا دیگر لیڈران کو؟

اشفاق احمد۔۔۔۔ نہیں گاندھی جی کو تو نہیں دیکھا البتہ پنڈت نہرو کو دیکھا جب وہ موچی دروازے آئے تھے۔ علامہ مشرقی کی کتابوں سے بھرپور متاثر رہا، عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقاریر بھی بہت سنیں۔

میں نے، نہ نواب صاحب نے۔

س۔۔۔۔ آپ کا مذہبی پچ تو شروع ہی سے رہا ہے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔ یہ تمام شرفاء کے گھروں میں ہوتا ہی تھا۔ اب آپ خواہ میرے بچوں اور پوتوں کی طرح ہیں آپ لاکھ کہیں کہ میرا مذہبی پچ نہیں ہے لیکن وہ تو بہر حال ہے۔ آپ کے محمود مرزا صاحب ''پاکستان سب کا'' کہیں، ''اور مذہب اپنا اپنا'' لکھیں لیکن مذہب کا رول تو رہے گا وہ تو وسعت نظر پیدا کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔

س۔۔۔۔ کہتے ہیں جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں باقیوں کا تو مجھے نہیں پتہ لیکن آپ دونوں کی جوڑی لگتا ہے واقعی آسمانوں پر بنی ہوگی؟

اشفاق احمد۔۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ اللہ ہی کی مہربانی ہے۔

س۔۔۔۔ آپا تو کہتی ہیں کہ اشفاق صاحب ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔ ہاں یہ ٹھیک بات ہے جیسے وہ اُردو میں کمزور تھی۔ میں نے محنت کروائی۔ وہ کام ایم اے پاس کرنے کے لیے کیا اور پھر اس نے میری حوصلہ افزائی پر باقاعدہ لکھنا بھی شروع کر دیا پھر ناول لکھا۔

س۔۔۔۔ ''راجہ گدھ'' تو ایک شاہکار بنا؟

اشفاق احمد۔۔۔۔ کیا بات ہے جی، یہ سب اللہ کے کام ہیں۔

س۔۔۔۔ آپ کو یہ آئیڈیل جوڑی کیسی لگتی ہے۔ جن کا ایک ہی رخ ہے ایک ہی روٹ ہے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔ بالکل۔ کوئی جیلسی نہیں، آئیڈیل جوڑی ہے۔

س۔۔۔۔ اماں ابا سے آپ نے اس سلسلے میں اظہار کیسے کیا؟

اشفاق احمد۔۔۔۔ میں اپنے ابا جی سے اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں Face نہیں کر سکتا تھا اور ہمارے خاندان میں باہر شادیاں ہوتی بھی نہیں تھیں جبکہ ہم راجپوت تھے اور یہ جاٹ، بہر حال گھر میں دبا دبا ذکر ہوتا تھا۔ ایک دن ابا جی ان کے گھر کینال پارک میں گئے۔ بیٹھے تو دیکھا کہ وہ چارپائیاں اٹھا کر اندر رکھ رہی ہیں انہوں نے پوچھا کہ تم تو ایم اے پاس نہیں ہو؟ کہنے لگی ہاں لیکن میں یہ کام کر لیتی ہوں اس پر وہ

بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے پاس کر دی۔ لیکن ہماری اماں ذرا سخت تھیں وہ خاندان کی وجہ سے پسند نہیں کرتی تھیں وہ کہتی تھیں کہ "چٹھہ" نام ہی بڑا فضول ہے۔ اس طرح کے تاثرات ان کی فیملی میں بھی تھے لیکن بہر حال جو خدا کو منظور تھا ہو کر ہی رہا۔

س ــــ خان صاحب آپ کے بچے کتنے ہیں؟

اشفاق احمد ــــ میرے تین بیٹے ہیں بیٹی کوئی نہیں؟

س ــــ وہ کیا کرتے ہیں؟

اشفاق احمد ــــ میرا بڑا بیٹا پروفیسر ہے۔ وہ یہاں نہیں امریکہ کی یونیورسٹی میں ہوتا ہے۔ دوسرا فارماسوٹیکل کمپنی میں ملازم ہے۔ تیسرا بنکر ہے۔

س ــــ کیا وجہ ہے ادب کی طرف کوئی نہیں آیا؟

اشفاق احمد ــــ کوئی بھی نہیں آیا یہ ان کی مرضی ہے۔

س ــــ "تلقین شاہ" آپ کی ذات سے زیادہ قریب ہے یا ہدایت اللہ کے؟

اشفاق احمد ــــ میں سمجھتا ہوں کہ تلقین شاہ تو ایک مثالی شخص (Figure Examplary) ہے۔ لیکن میرا مزاج جو ہے وہ ہدایت اللہ کا ہے یعنی کاش میں ایسا ہو سکوں۔ یہ نہیں کہ میں ہدایت اللہ ہوں بلکہ میرا رول ماڈل وہ ہے۔ اب لوگوں کا بھی رول ماڈل وہی ہے۔

س ــــ ایک "زاویہ" پروگرام تھا؟

اشفاق احمد ــــ وہ تو ابھی بھی چل رہا ہے۔

س ــــ ایک دفعہ بند ہوا تھا نا؟

اشفاق احمد ــــ ہاں، وہ بیچ میں بند ہو گیا تھا۔ بلکہ میں آپ کو بتاؤں زاویہ کی ایک Viewer ہیں مسز پرویز مشرف تو وہ مجھے کہنے لگیں کہ "جی میں تو ایک ہی کا پروگرام دیکھتی تھی۔ آپ نے بند کیوں کر دیا"۔ میں نے کہا 'بی بی 12 اکتوبر کو فوجی آ گئے تھے، تو ہم ان سے ڈر گئے۔' تو ان کا خاوند بھی سُن رہا تھا، کہنے لگا "سر! ہم نے آپ سے کیا کہا؟" میں نے کہا "دیکھئے آپ سے ہم نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن ہم T.V والے ہیں۔ ہمارا فرض ہے ڈر جانا، کیونکہ ہم خوف زدہ لوگ ہیں ہم کہتے ہیں اللہ جانے پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ ہم پہلے ہی بوریا بستر سمیٹ کر گھر چلے جاتے ہیں سو ڈرنا ہمارا فرض ہے جیسے مارشل لاء لگانا آپ کا فرض" کہنے لگے "نہیں سر میں نے تو دیکھا ہی نہیں آپ اس کو چالو کریں۔"

س ـــــ آپ جمہوریت کے بڑے حامی ہیں لیکن جنرل مشرف اس کے باوجود آپ کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ ان کو ایسے ہی وہم سا ہو گیا ہے کہ میں کوئی بڑا اچھا لائق آدمی ہوں۔ نیک بھی ہوں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔

س ـــــ انہوں نے آپ کو بلایا بھی تھا ایک مرتبہ؟

اشفاق احمد ـــــ میں تو خوف زدہ ہو گیا بھلا میرا کیا کام۔ تو میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ کہ مل ملا لو اب آخری وقت ہے۔

یہ بھی خوفزدہ ہو گئی۔ پھر میں نے کہا ''جی میرے پاس تو ٹکٹ نہیں ہے اس لیے میں کل انشاء اللہ۔۔۔''

انہوں نے کہا ''نہیں آپ کی ٹکٹ تو موجود ہے کور کمانڈر کے پاس بس آپ آجائیں، آدھا گھنٹہ میں''۔

میں پریشان تھا کہ پھر فون آ گیا وہاں سے کہ ''جی آپ نے اکیلے نہیں آنا، آپا کو بھی لے کر آنا ہے'' آپا سے وہ بھی بڑے متاثر ہیں۔

میں نے کہا ''جی انشاء اللہ''۔

تو پھر ہم ڈرتے روتے پیٹتے گئے شام کا وقت تھا آپ کی آپا کی کوئی Trainiy نہیں ایسے مواقع کی وہ کوئی سیاستدان نہیں بیچاری اس نے کہا ''جی پرویز آپ نے تو بہت ڈالر اکٹھے کرنا شروع کئے ہیں وہ کریں گے پھر یہ کریں گے۔ مگر آپ ہمیں یہ بتائیں کہ What About Human Benefit کیونکہ اس کا تو کوئی پروگرام ہی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپا یہ Human Benefits کے لیے تو کر رہے ہیں۔ ملکی حالات بہت خراب ہیں اقتصادی صورت حال بہت بری ہے وغیرہ وغیرہ۔

تو اس نے کہا نہیں جی میں یہ سمجھتی ہوں کہ میرے ملک کے جو چودہ کروڑ بندے ہیں وہ روٹی کپڑا اور مکان نہیں مانگتے۔ وہ تو ایسے کندھے کی تلاش میں ہیں۔ جس پر سر رکھ کر وہ رو سکیں۔ اور میرے ملک میں وہ کندھا نہیں ہے۔ وہ کیسے Provide کریں گے آپ، پھر وہ چونکے۔

وہاں ایک اور بھی جرنیل تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپا آپ نے سنا ہے پنجابی کا محاورہ کہ

جدھی کوٹھی وچ دانے
اوہدے کملے وی سیانے

بانو نے کہا کہ ''بس پچھلے 53 برس سے یہی غلطی ہوتی رہی ہے کہ آپ نے کملوں کو سیانا کرنے کے لیے

ان پر دولت کی چادر ڈال دی۔ اب آئندہ ایسا نہ کرنا۔'' میں حیران ہو گیا کہ ان کے پاس تو کوئی جواب ہی نہیں تھا پہلے بھی آپ یہی کرتے رہے۔ اب اللہ کے واسطے کملوں کو کملا ہی رہنے دیں اور سیانوں کو سیانا رہنے دیں۔

تو بس ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ اچھا آدمی ہے۔ مجھ سے بھی ایسی ہی باتیں پوچھ رہے تھے لیکن ان کی سوچ System کے اندر چلتی ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو Systems ہیں وہ ماتحت ہوتے ہیں نوع انسانی کے۔ جو شخص نوع انسانی کی بہتری کا سوچنے لگے پھر وہ اس طرف آئے تو بہتر ہو گا لیکن جو شروع یہاں سے کرتا ہے مثلاً چند روز قبل President صاحب گورنر ہاؤس آئے ہوئے تھے تو وہ چار باتیں بتا رہے تھے کہ ہم Transparency کریں گے۔ دوسرے یہ کہ ڈالر آ جائے گا۔

پیسے آ جائیں گے تو ہم یہ کام کریں گے۔

س ــــ لیل و نہار اور ریڈیو سے آپ اُردو سائنس بورڈ میں کیسے پہنچ گئے؟

اشفاق احمد ــــ مجھے سائنس بورڈ میں بلا لیا گیا کہ آپ یہ کام تو کر دیں چونکہ اس میں تو کوئی Editorial نہیں ہوتا تھا اس لیے وہاں چلا گیا۔ الحمد للہ وہاں پر تیئس برس گزارے یعنی ساری عمر کٹ گئی۔

س ــــ یہ طویل تجربہ کیسا تھا؟

اشفاق احمد ــــ بہت اچھا! یہ تو ایک لمبی کہانی ہے الگ سے ہی ایک مضمون ہو سکتا ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ ایک تو میرے ذہن میں اٹلی رہنے کی وجہ سے جیسے کہ میں کہتا ہوں کہ مجھے Experience ہوا میں تصویریں دکھا رہا تھا اپنی بیوی کو اٹلی کے زمانے کی اس میں ایک چھوٹی سی کار تھی جسے کہتے ہیں جو ہیا وہ Feat Car تھی کہنے لگی یہ کار اتنی چھوٹی؟

میں نے کہا ایسی ہی ہوتی تھی لیکن اس میں چار بندے بیٹھ جاتے تھے آسانی سے، میں اس پر دفتر آتا جاتا تھا یہ بہت Popular تھی، کہنے لگی کمال کی ہے یہ کہاں کی ہے میں نے کہا اٹلی کی۔

اس نے کہا ''کیا اٹلی کار بھی بنا لیتا ہے'' مزید کہنے لگی کہ ''وہاں تو کوئی انگریزی بھی نہیں جانتا تو جس ملک میں انگریزی ہی نہ پڑھائی جاتی ہو تو کیسے ترقی کر سکتا ہے۔'' یہ اس کا خیال تھا اور ہم سب کا یہی خیال ہے۔

تو میں نے کہا کہ یہ ساری کی ساری کار Italian کی بنائی ہوئی کار ہے۔ اور کوئی بھی انگریزی نہیں جانتا وہاں پر۔ اس پر کہنے لگی جبھی اتنی چھوٹی ہے۔

یہاں بات ہنسی پر ختم ہو گئی۔

لیکن جب میں سائنس بورڈ میں آیا تو میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ اور مضامین تو چاہے اپنی زبان میں

پڑھائے جائیں سائنس کے مضامین جب تک اُردو میں نہیں ہوں گے یا اپنی زبان میں نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک کوئی اختراع کوئی ایجاد ہو ہی نہیں سکتی۔ اپنی اس ذمہ داری کے دوران ایک دفعہ ایک میڈیکل کالج میں گیا اور وہاں کے پرنسپل سے ملا، ان سے کہا کہ جناب آپ جو پڑھاتے ہیں اس کورس کو اُردو میں تبدیل کروائیں۔ کہنے لگے نہیں نہیں اُردو میں نہیں کرنا، اُردو میں بندہ مرجاتا ہے، انگریزی میں ٹھیک رہتا ہے، بندہ نہیں مارنا چاہیے۔

میں نے کہا آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ انہوں نے مجھے اپنا کورس دکھایا، اس میں 100 نمبر کا ایک پرچہ تھا جنسی امراض کے اوپر۔ میں نے کہا آپ یہ کیوں پڑھاتے ہیں؟ ہمارے ملک میں تو ہے ہی نہیں یہ مرض اللہ کے فضل سے مہربانی ہے، سوزاک آتشک وغیرہ نہیں ہے، اس میں ہماری کوئی خوبی نہیں لیکن یہاں یہ ہے ہی نہیں کہنے لگے بس جی یہ شروع سے کورس میں چلا آرہا ہے اور انگریزوں نے بنایا ہے یہ کورس۔

ولایت میں کیونکہ یہ مرض بہت عام ہے اس لیے وہاں یہ ہے پھر میں نے ان سے کہا مجھے ذرا وہ پیپر دکھائیں جن میں لاکڑہ کاکڑہ یعنی جو بچوں کو خسرہ ہوجاتا ہے، اس کے متعلق بتائیں۔

کہنے لگے چونکہ خسرہ کے اوپر کوئی کتاب انگریزی میں نہیں ہے۔ اس لیے ہم یہ کم ہی پڑھاتے ہیں۔ میں نے کہا جناب کوئی بچہ حرامی ہوگا جس کو خسرہ نہ ہو یہ تو سب کو ہی ہوتا ہے، خسرہ کے متعلق جو کتاب اُردو میں لکھی جائیگی ظاہر ہے وہ زیادہ پڑھی جائے گی مگر وہ تو موجود ہی نہیں ہے۔

ہماری ساری زندگی چونکہ مرہونِ منت ہے انگریز حکمران کی، اس لیے اُردو میں کچھ تو کتابیں لکھی نہیں جاسکیں، لیکن کوئی بھی کتاب جسے آپ کہہ سکیں کہ وہ مخترع ہے یعنی اس نے کوئی اختراعات کی ہو وہ اُردو میں نہیں آسکی، ماسوائے میری ایک کتاب کے "ریگستانی ٹڈی کا ہضمی نظام"

تو یہ کتاب جب ہم نے چھاپی اور اعلان کیا کہ چھاپ رہے ہیں تو ہمیں چیکوسلواکیہ سے ایک خط آیا کہ اس کی 100 کاپیاں ہمیں بھیج دیں۔ میں نے کہا کہ ابھی یہ اُردو میں ہے۔ انہوں نے کہا کچھ بھی ہو ہم ترجمہ کرالیں گے لیکن اس کے ہضمی نظام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔

س ـــــ آپ نے بیوروکریسی کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟

اشفاق احمد ـــــ بچے! بیوروکریسی بیچاری تو کچھ نہیں کرتی بس ایک نوجوان کو جو ماشاء اللہ گریجوایٹ بھی ہے اور شریف گھرانے کی وجہ سے کچھ اخلاقی ویلیوز بھی رکھتا ہے، اسے محض جھوٹ کی عادت ڈال دیتی ہے! تھوڑی بہت ہیرا پھیری کے گر سکھا دیتی ہے۔ بیوروکریٹ اس کے سابقہ کریکٹر کو بس زائل کرتا ہے کیونکہ

اسے جب تک Emotional نہیں کرے گا اس کی گرفت کمزور رہے گی عطاء الرحمٰن نے مجھے کہا کہ میں آپ سے بڑی محبت کرتا ہوں مجھے بتاؤ کمپیوٹر اور آئی ٹی وغیرہ کے ذریعے نوجوانوں کو کیسے تگڑا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ محض ہزار ڈالر کمانے سے تو وہ تگڑا نہیں ہوگا شاید اس سے الٹا کمزور ہو جائے ہماری کچھ اخلاقی قدریں بھی ہیں کچھ ادھر بھی توجہ دو۔

س ـــ میں نے بیوروکریسی کی اخیر یہ دیکھی ہے کہ چند سہولتوں، چند مفادات کے وہ بھوکے ہوتے ہیں اس سے آگے کا وہ سوچ ہی نہیں سکتے؟

اشفاق احمد ـــ اور مفادات بھی گندے، کار، ڈرائیور، چپڑاسی بچوں کو سکول لانے لے جانے والا۔ بیوروکریسی کا پہلا تحفہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہونے کا بندے میں جو ڈنگ ہوتا ہے وہی نکال دیتے ہیں۔ اصل نکال دیا اور پتہ بھی نہیں چلا، چھتر کھائیں گے تو گھر آجائیں گے۔

س ـــ آمریت کے مقابلے میں آپ جمہوریت کو بہتر قرار دیتے ہیں لیکن ہمارے ہاں اگر آپ تجزیہ کریں تو قریباً دس فیصد لوگ ہوتے ہیں جن کا یہ سارا مخمصہ ہوتا ہے نوے فیصد تو اس سے بے خبر ہوتے ہیں؟

اشفاق احمد ـــ بالکل، کبھی کسی نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ کبھی ہماری جمہوریت کا بھی جائزہ لے کر دیکھ لیا جائے۔ یہ نیچے عام لوگوں تک تو جا ہی نہیں پاتی اوپر ہی اوپر ایم این ایز اور ایم پی ایز کے چچوں کی چم چم ہوتی ہے۔ مختلف حربوں سے جو جیتتے ہیں وہ پہلے تو اسمبلیوں میں گروپوں کی صورت اختیار کرتے ہیں، پھر ان میں کچھ اجلاس میں سونے والے ہوتے ہیں اور کچھ پارٹی کے لیڈر انگوٹھا چھاپ ہوتے ہیں جو اسمبلی میں ٹکا ٹک کرتے ہیں جو منسٹر بن جاتے ہیں وہ ذاتی کمائی میں لگ جاتے ہیں۔ جو بول رہے ہوتے ہیں ان کی نظر آئندہ کی وزارت پر ہوتی ہے۔

س ـــ سر! ذرا سیکولرزم کا بھی پوسٹ مارٹم کریں؟

اشفاق احمد ـــ سیکولرز سے عام ذہنوں میں جو کچھ آتا ہے وہ ہے Nonreligious یعنی Religion سے اس کا کوئی تعلق نہیں مجیب کو فکر لگی ہوئی ہے کہ اشفاق صاحب یہ کیا ہو رہا ہے۔ ملک سب کا، مذہب اپنا اپنا، یہ NGO یہ سیمینار، یہ انٹرنیشنل فورم وغیرہ کیا کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں ہمارا مذہب اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتا اس کی وجہ ایک، تو ہماری عائلی زندگی ہے، مرد عورت کے تعلقات ہیں دوسری ہماری اجتماعی زندگی ہے۔ جو مذہب سے عبارت ہے۔

س ـــ ہماری گھریلو زندگی میں ماں کا مرتبہ باپ سے زیادہ ہے؟

اشفاق احمد ـــــ نہیں اس میں نہ ماں کا رتبہ زیادہ ہے نہ باپ کا، دونوں کو اسلام ادب کی نگاہ سے دیکھ
ہے۔ اسلام تو اس کو نہیں مانتا کہ عورت کا درجہ مرد سے زیادہ ہو۔

س ـــــ جو تکلیف ماں سہتی ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے؟

اشفاق احمد ـــــ یہ جو باہر کھڑا دھوپ میں سنگھاڑے بیچ رہا ہے، جس نے ریوڑیوں کا چھابہ لگایا ہوا ہے اور سالہا
سالوں سے یہ تکلیف سہہ رہا ہے۔ 9 مہینے کی تکلیف اس سے کیسے بڑھ گئی۔ اس حرام زادے کا تو ستیاناس ہو گیا۔

س ـــــ آپ کی نظر میں پاکستان کی پرابلم نمبر 1 کیا ہے؟

اشفاق احمد ـــــ ہماری پرابلم نمبر 1 یہ ہے کہ جو ہمارا حکمران طبقہ ہے ان کا پاکستان کے لوگوں سے کوئی
تعلق نہیں ہے پاکستان کی ذات سے، پاکستان کے کلچر سے، پاکستان کی دھرتی سے، ان کا کوئی تعلق نہیں
ہے۔ یہاں پیدا ہونے والی خوراک سے، یہاں کی گیس اور پٹرول سے تو ان کا گہرا تعلق ہے۔ جس سے وہ
فائدہ بھی اٹھاتے چلے جارہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو برا بھی کہتے ہیں اس کے بندوں کو نہیں مانتے لیکن
اس ملک کی جان بھی نہیں چھوڑتے۔ کاش کوئی ایسا طریقہ ہو میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان خواص کو
انہی بیچارے عوام میں شامل کر دے۔

آپا صغراں جو تندور میں روٹیاں لگاتی ہے، یہ لوگ اس کو بھی پورا پاکستانی مان لیں، اس بیچاری نے تو
کوئی کالم نہیں لکھنا اس نے تو روٹیاں ہی لگانی ہیں نا لیکن اسے عزت تو دے دو، یہ تو اس کا حق ہے نا۔۔۔
لہٰذا ہمارا مسئلہ نمبر 1 ایک یہی ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے سیانے طبقے نے ہمارے اوپر ایسٹ انڈیا کمپنی کی
طرز پر حکومت شروع کر دی ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی میں تو پھر بھی کچھ خوبیاں تھیں جبکہ ہمارے موجودہ حکمران
طبقے میں وہ بھی نہیں ہیں جب انگریز حکمران تھا اور میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتا تھا تو میں اس کو ڈرا دیتا تھا کہ کل
میری گیارہویں شریف کا ختم ہے اس لیے میں چھٹی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ جو بدمعاش ہیں یہ کہتے ہیں کہ
کونسی گیارہویں شریف، ہمیں نہیں پتہ، جا بیٹھ جا کے۔

س ـــــ آپ پاک بھارت تعلقات کو کیسے دیکھنا چاہتے ہیں؟

اشفاق احمد ـــــ میں پاک بھارت تعلقات کو اس طرح دیکھنا چاہتا ہوں کہ بھارت جو ایک بڑی
تہذیب ہے وہ لوٹ کر اپنی بڑائی کی طرف آ جائے اور یہ سوچے کہ میں نے کتنا چھوٹا رول ادا کیا ہے۔ اتنا
بڑا ہونے کے باوجود آخر چھوٹا پن کیوں ہے؟

س ـــــ عالم اسلام میں جمہوریت نہ ہونے کی وجہ آپ کی نظر میں کیا ہیں؟

اشفاق احمد ــــــ عالم اسلام شائد جمہوریت کا زیادہ قائل ہی نہیں ہے۔ معلوم نہیں اگر ادھر جمہوریت قائم ہو بھی جائے تو کیا حال ہو جائے۔ میں جمہوریت کے بڑا حق میں ہوں مگر اسی جمہوریت نے فاشزم کو بھی جنم دیا ہے۔ بھٹو کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ہمارے ملک میں بھی جمہوریت کے نام پر ایسے لوگ آتے رہے ہیں جن کو آپ انسان بھی کم ہی کہیں گے۔ شائد عالم اسلام کو جمہوریت کی ضرورت نہیں ہے ان کی فراست اپنے خدا کو خوش کرنے کی ہے۔ آپ اس کے طریقے ڈھونڈیں۔

س ــــــ ایک ملاقات جو آپ کبھی نہیں بھولا سکتے؟

اشفاق احمد ــــــ 1966ء میں ایک ملاقات چیئر مین ماؤ سے ہوئی تھی جو بڑی ہی یادگار تھی اس کے بارے میں، میں رپورتاژ لکھ بھی چکا ہوں۔ ایک ملاقات میں نے اپنے بابا حضرت سائیں فضل شاہ صاحب نور والے سے کی جو پھیلی پھیلتی میری ساری زندگی پر حاوی ہوگئی اس کی تبلیغ میں ابھی تک کئے چلا جا رہا ہوں۔

س ــــــ آپ دیہی اور شہری زندگی کا فرق کس طرح دیکھتے ہیں؟

اشفاق احمد ــــــ بنیادی بات یہ ہے کہ شہری بندہ اپنے آپ کو انسان سمجھتا ہے جبکہ دیہی بندہ باوجود اس کے کہ وہ بھی انسان ہی ہوتا ہے مگر شہر کا بندہ اس کو بندہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ آپ اس کو ان پڑھ کہہ کر دھتکار دیتے ہیں۔

س ــــــ دنیا میں سب سے خوبصورت خطہ کونسا لگا؟

اشفاق احمد ــــــ اٹلی مجھے بہت پسند آیا تھا۔ تاریخی اعتبار سے بھی اور حسن کے اعتبار سے بھی۔

س ــــــ عزت نفس کی بحالی کا شدید احساس کیسے جاگزیں ہوا؟

اشفاق احمد ــــــ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا چونکہ میں فکشن رائٹر ہوں اس لیے جب میں اپنے گردونواح میں کسی کو ذلیل ہوتے دیکھتا ہوں تو مجھے بہت محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی بھوکا ہو تو مجھے اس سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کسی کو ذلیل ہوتے دیکھ کر ہوتی ہے۔

س ــــــ جب کوئی کسی کو اس کی محنت کا معاوضہ نہ دے تو۔۔۔؟

اشفاق احمد ــــــ بہت بری بات ہے۔

س ــــــ کیا غربت سے بڑی بھی دنیا میں کوئی تکلیف ہے؟

اشفاق احمد ــــــ غربت سے بڑی تکلیف شائد کوئی نہ ہو لیکن عزت نفس خراب ہونے کی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے ولایت میں بھی غربت کو دیکھا ہے لیکن بحیثیت شہری ان کے حقوق پامال نہیں ہوتے کوئی یہ نہیں کہتا کہ پیچھے ہو کر کھڑا ہو۔ عزت نفس کے لٹنے سے ہی غربت کا تصور بدنما بنتا ہے۔

ساتھ رہنا پسند کریں گے یا آپا جی کے ساتھ؟

س۔۔۔۔۔ جنت میں 70 حوروں کے ساتھ رہنا پسند کریں گے یا آپا جی کے ساتھ؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ میں یقیناً ستر حوروں کے ساتھ رہنا ضرور پسند کروں گا کیونکہ وہ بھی آپا جی کی سہیلیاں ہی ہوں گی اور ان کے جیسی ہی ہوں گی۔

س۔۔۔۔۔ زندگی کا خوشگوار ترین اور ناگوار ترین دن؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ ناگوار ترین تو شاید اللہ کے فضل سے کبھی آیا ہی نہیں ہے اچھے بندے ملتے رہے ہیں اور زمانہ بھی میرے ساتھ اچھا رہا ہے۔

س۔۔۔۔۔ پسندیدہ حکمران۔

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ پاکستان میں میرا پسندیدہ حکمران چودھری محمد علی تھا۔

س۔۔۔۔۔ پسندیدہ شعر

اشفاق احمد۔۔۔۔۔

ہے کہاں تمنا کا، دوسرا قدم یا رب
ہم نے نقش امکاں کو ایک نقش پا پایا

س۔۔۔۔۔ پسندیدہ شام۔

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ بہت شامیں آئیں۔ 64ء میں ٹی وی کے نیا آنے سے جو شامیں جمتی تھیں وہ ساری پسندیدہ تھیں۔

س۔۔۔۔۔ پسندیدہ شہر۔

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ روم میرا پسندیدہ شہر ہے۔

س۔۔۔۔۔ پسندیدہ مشروب اور ڈش۔

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ سردائی میرا پسندیدہ مشروب ہے میٹھی ڈشیں پسند ہیں۔

س۔۔۔۔۔ کیا آپ ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ''اپنا گریباں چاک'' پر کوئی کمنٹس دینا چاہیں گے؟

اشفاق احمد۔۔۔۔۔ میں نے وہ کتاب پوری پڑھی ہے اور مجھے بڑی پسند آئی بالخصوص ان کی خود کلامی والا حصہ تو مجھے بہت ہی اچھا لگا ہے اور شائد اس پر بہت کم لوگ توجہ دیں گے لیکن اصل چیز یہی ہے۔ میرے خیال میں شائد یہ سوانحی لحاظ سے اُردو میں پہلی کتاب ہے جس میں اس اسلوب کو اپنایا گیا ہے اس سے صاحب کتاب گریٹ رائٹر اور گریٹ تھنکر نظر آتا ہے جاوید بڑا لبرل آدمی ہے۔ اچھے اخلاق کا مالک ہے جو

دین کا خاصہ ہے میرے خیال میں جاوید پرانی ڈورس کی پرورش اور تربیت کے بھی بڑے مثبت اثرات ہیں اور پھر وہ ولایت بھی گئے اور وہاں کی تہذیب کے لبرل اثرات بھی ہوئے۔ جس طرح ڈاکٹر جاوید ہیں یا جس طرح آپ لبرل ہیں میں اس کی قدر ضرور کرتا ہوں لیکن میں تو لبرل نہیں ہوں کوئی بھی پاکستان لبرل نہیں ہے۔

آپ کی نظر میں

ل ۔۔۔ عشق محبت؟

اشفاق احمد ۔۔۔ ایک نارمل زندگی کا بہت اہم حصہ ہے۔ ہر انسان اس میں سے گذرتا ہے نہ گزرے تو مکمل نہیں ہوتا۔

ل ۔۔۔ نفرت و حقارت؟

اشفاق احمد ۔۔۔ ایسا فعل ہے جو آدمی نے سیکھا ہے جبلی چیز نہیں ہے اسے آسانی سے چھوڑا جا سکتا ہے۔

ل ۔۔۔ لالچ اور حسد؟

اشفاق احمد ۔۔۔ یہ بڑی جبلی چیزیں ہیں مثلاً ہم پیشہ ور لوگ ہیں تو حسد تو ہمارے اندر آئے گا۔ چاہے آپ اس کا اظہار نہ کریں لیکن دل میں آئے گا۔

ل ۔۔۔ کیا آپ کو غصہ آتا ہے؟

اشفاق احمد ۔۔۔ بہت زیادہ مگر اب ہی آنے لگا ہے جوانی میں بالکل نہیں آتا تھا۔ میں ایک اچھا خوشگوار سا موڈ رکھنا چاہتا ہوں مگر ایسے رہا نہیں جاتا۔

ل ۔۔۔ تصنع اور ریاکاری؟

اشفاق احمد ۔۔۔ یہ لوگوں میں بہت ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ کوئی مجھے زیادہ برا نہیں لگتا۔

ل ۔۔۔ غصے کا اظہار کیسے کرتے ہیں؟

اشفاق احمد ۔۔۔ اونچی بول کر اور طنزیہ جملے کہہ کر۔

ل ۔۔۔ زندگی میں کب پھوٹ پھوٹ کر روئے ہیں؟

اشفاق احمد ۔۔۔ جی ہاں بہت زیادہ، بابوں کے ساتھ ڈیروں پر ملاقاتوں میں بے وجہ بھی کئی دفعہ گریہ طاری ہو گیا۔ کسی بابے یا صاحب حال نے کوئی ایسی بات دانش و معرفت کی کہہ دی یا کی تو انہیں سن کر رونا آ جاتا تھا۔

ل ۔۔۔ جب بہت فرسٹریشن محسوس کی۔

اشفاق احمد ۔۔۔ [illegible]

س ــــــ جب بے بسی محسوس کی؟

اشفاق احمد ــــــ میں تقریباً ہر جھوٹے آدمی کے سامنے بے بس ہو جاتا ہوں۔ اس کا شافی جواب نہیں دے سکتا جھوٹ کے سامنے بے بس ہوں۔

س ــــــ زندگی اور موت؟

اشفاق احمد ــــــ زندگی سے پیار ہے اور موت کی حقیقت تسلیم کرنے کے باوجود اس سے خوف اور گھبراہٹ ہے اُسے دور دھکیلنے کو جی چاہتا ہے۔

س ــــــ آپ نے اپنے کام کے حوالے سے ایک بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری ہے اگر میں آپ سے یہ پوچھوں کہ آپ نے زندگی سے کیا سبق سیکھا ہے؟

اشفاق احمد ــــــ میں نے زندگی سے یہ بنا بنایا سبق سیکھا ہے کہ انسان کو ہر حال میں محنت اور بے حساب محنت کرتے رہنا چاہیے، تسلسل کے ساتھ، لیکن اس محنت کا تعلق کامیابی کے ساتھ نہیں ہے وہ تو خدا نے دینی ہے لیکن بشریت کی شان یہ ہے کہ وہ محنت سے جی نہ چرائے۔

س ــــــ کوئی خواہش جو ہنوز تشنہ ہے؟

اشفاق احمد ــــــ کوئی نہیں، میری کوئی خواہش پیدا بعد میں ہوتی ہے مکمل پہلے ہی ہو چکی ہوتی ہے، زیادہ تمنائیں پیدا نہیں ہوتیں، بہت اچھا وقت گزرا، ٹھنڈا گرم سب ملتا رہا، میں ان ایک لاکھ لوگوں میں سے ہوں جو پاکستان کے حکمران ہیں ان میں تمام شعبہ جات کے لوگ ہیں اصل مسئلہ تو دوسرے طبقے کا ہے۔

س ــــــ یہ تو بڑی تلخ حقیقت ہے؟

اشفاق احمد ــــــ بہت تلخ چودہ کروڑ ان ایک لاکھ کے غلام بنے ہوئے ہیں۔

س ــــــ خداوند آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے لیکن اپنے بعد کس طرح یاد رکھے جانا پسند کریں گے؟

اشفاق احمد ــــــ میری آرزو ہے کہ میری قبر اچھی سی کچی سی ہو، جس پر ایک ہینڈ پمپ ضرور ہو، تاکہ مسافر وہاں پانی پی لیا کریں ایک ڈھولکی والا ہو، جو قوالی کے انداز میں کچھ پڑھ رہا ہو، شعر چاہے غلط ہی پڑھے کیونکہ پڑھے لکھوں کے پاس تو وقت ہوتا نہیں ہے، وہ تو کوئی ان پڑھ آدمی ہی ہو سکتا ہے۔

(انٹرویو، افضال ریحان، قومی ڈائجسٹ)

☆☆☆

اشفاق احمد سے آخری انٹرویو

اشفاق احمد کی موت کو میں ادب کی موت کہوں، اکیسویں صدی کے آخری دانشور کی موت کا نام دوں، اسے ''تلقین شاہ'' کی موت کہوں یا ڈرامے کی دنیا کا اختتام کہوں یا عالم وادب کی دنیا کے ایک عہد کا خاتمہ قرار دوں۔ ان کی شخصیت کا ہر حوالہ ان کی ذات کا ہر پہلو اس قدر مضبوط اور مکمل ہے کہ ان کی کسی ایک صفت کو دوسرے پر حاوی نہیں کیا جا سکتا۔ اشفاق احمد جنہیں میں ایک عظیم انسان کہوں گا کیونکہ میرے نزدیک ان کی ذات کا یہی حوالہ سب سے مضبوط اور خوبصورت ہے اگر وہ عظیم انسان نہ ہوتے تو ان کی موت پر انسانیت کی آنکھیں اشک بار نہ ہوتیں۔ وہ کونسی آنکھ ہے جو ان کے چلے جانے سے اشکبار نہ ہوئی ہوگی کونسا دل ہے جو تلقین شاہ کی موت پر نہ رویا ہوگا۔

مَیں نے جب ٹیلی فون پر اشفاق صاحب سے رابطہ کیا تو بانو آپا نے کہا ''بیٹا خان صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ ڈاکٹر نے انہیں بولنے سے منع کر رکھا ہے۔ ذرا طبیعت سنبھلے گی تو وہ ضرور وقت دیں گے۔'' ان دنوں اخبارات میں اکا دکا خبریں بھی شائع ہوتی رہیں کہ اشفاق صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ تاہم مگر ایسی تشویش کی بات نہیں تھی اشفاق صاحب کو میں نے پہلے ٹیلی فون کے بعد دوسرا ٹیلی فون پندرہ روز بعد کیا فون پھر بانو آپا نے اٹھایا اور انہوں نے پھر وہی الفاظ کہے۔ ''بیٹا ڈاکٹر صاحب نے خان صاحب کو سخت آرام کی ہدایت کر رکھی ہے۔ بولنے سے بھی منع کر رکھا ہے۔ آپ بس دُعا کریں۔''

جب بانو آپا نے دوسری مرتبہ بھی خان صاحب کی صحت اور زندگی کے بارے میں دُعا کرنے کے لیے کہا تب میری چھٹی حس نے خبردار کر دیا کہ شاید ادبی دنیا کا یہ بوڑھا برگد اپنے سائے سے جدا ہونے والا ہے۔ میں نے بانو آپا سے بڑے اصرار کے ساتھ درخواست کی، میری یہ درخواست کارگر ثابت ہوئی اور بانو

آپا نے مجھے اگلے روز آنے کا کہہ دیا۔ کیونکہ میں اس سے پہلے بھی اشفاق صاحب سے تفصیلی انٹرویوز کر چکا تھا اسی لیے خان صاحب نے دیکھتے ہی بستر پر ٹیک لگا لیا مخصوص انداز میں پوچھا ''اپل صاحب کیا حال ہے آپ کا؟'' ''جی اللہ کا شکر ہے۔'' میں نے کہا میں تو صرف آپ کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا ان دنوں اشفاق صاحب کی طبیعت ناساز ضرور تھی۔ نحیف بھی کافی ہو چکے تھے مگر بات چیت بہر حال کر سکتے تھے۔

''خان صاحب آپ کو اس کیفیت میں اپنے دوست تو بہت یاد آتے ہوں گے۔'' میں نے تیمار پرسی کے ضابطے میں رہتے ہوئے رسمی سا سوال کیا۔ جس پر وہ ٹیبل پر رکھے گلاس سے پانی کا ایک گھونٹ لے کر کہنے لگے۔ ''ہر عہد کے لوگ میرے دوست رہے ہیں۔ دوستی کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔'' داستان سرائے'' میں رونقیں لگانے والے ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، انتظار حسین اور ابن انشا بھی میرے دوست تھے۔ یہ پچھلی صدی کے میرے دوست تھے اگر اس صدی کی آپ بات کرتے ہیں تو ''زاویہ'' میں آنے والے اور میری باتیں سننے والے بھی تو میرے نوجوان دوست ہی ہیں۔ اُپل میں تو خوش نصیب ہوں کہ ہر دور میں دوستوں میں گھرا رہا۔''

''ممتاز مفتی سے تو آپ کی بڑی یاری تھی۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں وہ ''علی پور کا ایلی'' حقیقت میں خود ہی تھا۔ مگر جب اس نے یہ کردار لکھا تو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ جوانی میں اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا اچھا نہیں لگتا مگر جب وہ بوڑھا ہوا تو اس نے اقرار کیا کہ وہ ''علی پور'' کا ایلی خود ہی تھا اور اس نے اپنے کردار پر یہ کتاب لکھی تھی۔۔۔ بڑا پیارا دوست تھا ایک بار جب میں اٹلی میں تھا تو وہ مجھے ملا۔ مجھے کہنے لگا یہاں کس جگہ رہتے ہو۔ میں نے پنجابی میں کہا۔ ''مفتی صاحب گوالیاں دے محلے وچ رہناں واں۔'' جس پر وہ میرے تھری پیس سوٹ کی طرف اشارہ کر کے پنجابی میں مجھ سے مخاطب ہوا ''یار اشفاق جدوں اسی انگریزی لباس پا کے پنجابی بولنے آں تے انج لگدا اے جیویں جھوٹ بولنے پئے آں۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں کیا واقعی ہم آج آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔''

میرے اس سوال پر خان صاحب کافی دیر خاموش رہے ان کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے بڑا تکلیف دہ سوال کر دیا ہو۔ قریب کھڑی بانو آپا کے چہرے کے تاثرات بھی یہ بتا رہے تھے کہ میں تیمار داری کے بہانے خان صاحب کا انٹرویو ختم کروں مگر خان صاحب کچھ بولنا چاہ رہے تھے میں بھی کاغذ پینسل ہاتھ میں تھامے ہمہ تن گوش تھا۔ بالآخر وہ دھیرے دھیرے کہنے لگے۔ ''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ

ہم نے آزادی کی صورت کھویا زیادہ اور پایا کم ہے کیونکہ ہم نے آزادی کے وقت 14 کروڑ عوام سے زیادہ اپنے لیے سوچا تھا۔ یہاں مولوی اسلام کی بات کرتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کا مطلب بولنا نہیں بلکہ عمل کرنا ہے مگر پچھلے 57 برسوں میں صرف بولا گیا ہے عمل نہیں کیا گیا اس لیے میرے نزدیک اس قوم کے شاندار مستقبل کی توقع کم ہے۔ اب تو اللہ ہی ایسا رخ دکھائے اور ہمارے حال پر مہربانی فرمائے جہاں تک آزادی کے سانسوں کا تعلق ہے تو میرے خیال میں آج کل ہم آزادی کے ڈھکوسلے لے رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آزادی کیا ہے اور کس چیز کا نام ہے۔"

"خان صاحب جب میں نے اور علی سفیان آفاقی نے سیارہ ڈائجسٹ کے لیے آپ کا انٹرویو کیا تھا۔ تب آپ نے آفاقی صاحب کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ جو مولوی ڈاڑھی رکھ کر انگریزی بولتا ہے وہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس وقت کے حالات کے مطابق تو آپ کا کہنا کہ شاید درست ہو مگر آج کل تو تقریباً ڈاڑھی رکھنے والا ہر مولوی ہی انگریزی بول لیتا ہے مگر ہم اسے خطرناک تو نہیں کہہ سکتے۔"

میرے اس سوال پر خان صاحب نے قدرے توقف کے بعد کہا "جب میں نے یہ بات کہی تھی اس وقت ملکی حالات شاید اتنے خطرناک نہیں تھے مگر آج جبکہ خود آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر ڈاڑھی رکھنے والا انگریزی بول لیتا ہے مگر آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ حالات اس قدر خطرناک ہو چکے ہیں کہ کوئی گھر کی چار دیواری کے اندر بھی محفوظ نہیں جب اللہ سے دوری اور حکمرانوں سے قربت ہوگی حالات تو پھر ایسے ہی ہوں گے میں تو اکثر "زاویہ" میں نوجوانوں سے یہی کہتا ہوں اگر کچھ پانا چاہتے ہیں تو اللہ کے نزدیک ہو جائیں۔

"خان صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی دے انسان کی خواہشات کا گھوڑا تو بے لگام ہوتا ہے آپ کی کوئی ایسی خواہش جو ابھی تک پوری نہ ہوئی ہو۔" مجھے ان کی طبیعت کے پیش نظر ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے تھا مگر پھر بھی میں نے ہمت کر لی جس پر خان صاحب یوں گویا ہوئے۔"

"جب آدمی خواہشات کا اظہار کرنے لگے تو سمجھو کہ اس کا آخری وقت قریب آ گیا کیونکہ خواہشیں عموماً انسان کی زندگی میں پوری نہیں ہوتیں یہ تو لفظ ہی نامناسب ہے ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا عزم اور ارادہ کیا ہے۔ واصف علی واصف فرمایا کرتے تھے "یقین، استقامت اور عمل جس کے پاس یہ تین چیزیں ہوں وہ کبھی اپنے لیے خواہش کا لفظ استعمال نہیں کرتا کیونکہ جس کے پاس یقین عمل اور استقامت ہو دنیا کی ہر چیز خود اس کے پاس چل کر آ جاتی ہے پھر خواہش کیسی؟"

''آپ نے واصف علی واصف کا ذکر فرمایا۔ آپ بھی ان کی محفلوں میں بہت جایا کرتے تھے۔ یہ غالباً 1965ء کی بات ہے۔ واصف علی واصف'' کالاہور نابھہ روڈ پر ''لاہور انگلش کالج'' ہوا کرتا تھا جس کے وہ پرنسپل بھی تھے۔ اس زمانے میں وہ انتہائی ماڈرن تھے سفاری سوٹ اور انگریزی لباس پہنا کرتے تھے، انگریزی بھی خوب بولتے تھے تب کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے وقت کے مشہور صوفی بزرگ قرار پائیں گے۔ ان کو دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً گیارہ برس ہو چکے ہیں ہر سال باقاعدہ ان کے مزار پر عرس ہوتا ہے۔ ڈھول بجتا ہے، ملنگ دھمال ڈالتے ہیں میں نے اتنا تفصیلی سوال اس لیے کیا کہ وہ آپ کے مرشد تھے۔ مجھے موقع نہیں مل سکا کہ واصف علی واصف سے پوچھتا کہ انہوں نے صوفیانہ زندگی کیوں اختیار کی مگر آپ سے تو یہ سوال یقینی طور پر کر سکتا ہوں۔''

''اُپل صاحب آپ مجھ سے زیادہ اس لیے بول رہے ہیں کہ میں صحت کے اعتبار سے زیادہ بول نہیں سکتا مگر شکر گزار ہوں کہ میرے حصے کا بھی آپ بول رہے ہیں آپ نے واصف علی واصف کی بات کی، میں واقعی ان سے بہت متاثر ہوں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صوفی ضرور تھے مگر مولوی نہیں تھے ان کے پاس بہت علم تھا مگر وہ علامہ نہیں کہلواتے تھے وہ صوفیانہ رنگ میں بھی پتلون بوشرٹ پہنتے رہے اور گاڑی ڈرائیور کرتے رہے انہوں نے اسلام کی بات نیکی اور ہدایت کی بات کرنے کے لیے مذہب کی دکان سجائی اور نہ مولویوں جیسا روپ دھارا اسی لیے میں ان کو اپنا مرشد مانتا تھا میں نے بھی تھوڑی سی کوشش تو ضرور کی ہے ان کے نقش قدم پر چلنے کی میں نے تو تب سے ہی اچھی باتوں کی تلقین کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جب 35 برس قبل تلقین شاہ شروع کیا اور ہدایت اللہ (نذیر حسینی) کو نیکی کی علامت کے طور پر پیش کیا تھا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ واصف علی واصف بہت بڑے صوفی بزرگ تھے۔ جب تک صحت ٹھیک تھی میں ان کے عرس پر بھی جایا کرتا تھا۔ قدرت نے مہلت دی تو آئندہ بھی جاؤں گا۔''

''آپ ''زاویہ'' میں جو کچھ کہتے ہیں کیا آپ کے خیال میں نوجوانوں یا سننے والوں پر اس کا اثر بھی ہوتا ہے؟''

''زاویہ'' کا مقصد یہ تھا کہ اس میں واعظ نہ ہو کتابی باتیں نہ ہوں لیکچر نہ ہو بلکہ یہ تو میری زندگی کے تجربات اور مشاہدات تھے جو میں دوسروں تک پہنچاتا رہا تاکہ میری کسی بات سے وہ اپنے لیے اصلاح کا پہلو ڈھونڈ لیں۔ اس پروگرام میں شریک نوجوان جب مجھ سے کوئی سوال کیا کرتے تھے تب میں محسوس کرتا تھا کہ وہ نیکی اور بھلائی کی راہ اپنانا چاہتے ہیں مگر ان کے اندر کی بات کوئی نہیں سنتا وہ کسی سے کھل کر اپنے

دل کا احوال نہیں کہہ سکتے۔ گھر میں وہ والدین کا لیکچر سنتے ہیں اور سکول، کالج، یونیورسٹی میں استاد کا لیکچر سنتے ہیں مگر ان کی کوئی نہیں سنتا مگر ''زاویہ'' اس لیے تھا کہ نوجوانوں کے دل کی بات سنی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نوجوانوں کو لیکچر کا سیرپ پلا کر ان کی اصلاح نہیں کی جا سکتی۔''

''آپ کے خیال میں اس قوم کی سب سے زیادہ خدمت کون کر رہا ہے؟'' یہ میرا سوال تھا۔

''خدمت کا لفظ بہت چھوٹا مگر اس کے پیچھے عمل بہت بڑا ہے۔'' اشفاق احمد رک رک کر کہنے لگے پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ آج کے دور میں صحیح معنوں میں کوئی بھی ایسا مخدوم نہیں ہے جس پر سب متفق ہو سکیں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ اس قوم کی سب سے زیادہ خدمت ''لہینہ جمعدار'' کر رہا ہے جب ہم صبح ابھی سوئے موئے پڑے ہوتے ہیں تو وہ ہماری گلی محلوں کی صفائی کر رہا ہوتا ہے ہم دیر تک نحوست ڈال کر سو رہے ہوتے ہیں اور وہ صبح اذانوں سے قبل جھاڑو دے کر ہماری گلی میں پہنچ جاتا ہے۔ اگر صفائی نصف ایمان ہے تو اس کا کچھ حصہ لہینہ جمعدار کو بھی ملنا چاہیے۔''

''اشفاق صاحب کیا ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ آپ کے بچوں میں سے بھی کوئی اشفاق احمد، تلقین شاہ یا بابا جی کے روپ میں سامنے آ سکتے ہیں۔''

''مجھے اللہ تعالیٰ نے بڑی نیک اور فرمانبردار اولاد کی نعمت سے نوازا ہے، اس کی ذات نے مجھے بیٹی نہیں دی مگر بہوؤں کی صورت میں یہ کمی بھی پوری کر دی رہا یہ سوال کہ میرے بیٹوں میں کوئی اشفاق احمد یا تلقین شاہ بن سکتا ہے۔ اس کے جواب میں یہی کہوں گا کہ وراثت میں دولت اور عقل و ذہانت تو مل سکتی ہے مگر نام مقام اور شہرت انسان کا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ لوگ میرے بچوں کو اس حوالے سے تو جانیں گے کہ یہ اشفاق احمد کے بیٹے ہیں مگر نام مقام اور شہرت ان کا اپنا نصیب ہے۔

(انٹرویو: ندیم اُپل، انصاف سنڈے میگزین)

☆☆☆

اشفاق احمد کو اردو ادب میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ اور وہ اعلیٰ پائے کے ادیب، کہانی نویس، براڈکاسٹر، دانشور اور صوفی تھے۔ ان کا شمار منفرد افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ یہاں اشفاق احمد کے تین منتخب خوبصورت اور منفرد افسانے دیئے جا رہے ہیں۔

○ عجیب بادشاہ ○ کایا پلٹ ○ بدلی سے بدلی تک

عجیب بادشاہ

کراچی کافی ہاؤس کی سیڑھیاں اُتر کر جب میں اپنی کرائے کی سائیکل کا تالا کھولنے لگا تو کسی پیچھے سے آکر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ سیدھے کھڑے ہو کر میں اُس ہاتھ پر ہاتھ پھیرتا رہا لیکن پتہ چلا کہ کون ہے۔ لمبی لمبی مضبوط انگلیاں، پشت دست پر سخت بال، بڑھے ہوئے ناخن، سخت گرفت کی سے کلائی پر اُبھری ہوئی نسیں اور سرسوں کے تیل کی سگریٹ میں ملی جلی خوشبو، ''معظم''؟ میں نے کہا مگر کوئی جواب نہ ملا ''قمر''؟ لیکن اس مرتبہ بھی کوئی نہ بولا۔ ''ممتاز''؟ اب بھی ہاتھ میری آنکھوں پر ہی رہا۔

ایک ایک کر کے میں نے اپنے تمام زندہ اور مُردہ دوستوں کے نام گنوائے مگر میری آنکھوں سے ہاتھ نہ ہٹا۔ پھر میں نے اپنا نام لے کر کہا۔ ''اب چھوڑیے صاحب! کہیں غلط فہمی میں تو میری آنکھیں بند نہیں کر رکھیں؟''

اس پر وہ ذرا سا ہنسا اور ہاتھ ہٹا لیا میں نے پلٹ کر دیکھا۔ زمان میلی سی نیلے رنگ کی اچکن پہنے مسکرا رہا تھا۔ میں اپنی فائل زمین پر پھینک کر اُس سے لپٹ گیا۔ پورے بارہ سال ایک دوسرے سے جدا

رہنے کی مکافات ہم نے یوں کی کہ دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے اور پٹریوں پر چلنے والے راہ گیر پیچھے مڑ مڑ کر دور تک ہمیں دیکھتے رہے۔ میں نے ٹھوڑی اُس کے کندھے پر رگڑتے ہوئے پوچھا۔ ''اتنا عرصہ کہاں رہے ظالم؟''

اس نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کر کہا۔ ''آبادان''۔

''آبادان؟'' میں نے ہٹ کر پوچھا۔

''ہوں۔'' زماں نے اپنی اچکن کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے اور بولا۔ ''تم سے جدا ہو کر چند مہینے تو بمبئی میں گزارے۔ اس کے بعد میں اینگلو ایرانین آئل کمپنی میں ملازم ہو کر آبادان چلا گیا اور اتنا عرصہ وہیں رہا۔ مجھے وہاں سے لوٹے ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا۔

''مگر تم نے آج تک مجھے کوئی خط کیوں نہ لکھا؟'' میں نے پوچھا۔

''خط!'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ یار میں نے لکھا ہی نہیں، کسی کو بھی نہیں لکھا۔ تمہیں معلوم ہے یار! مجھے خط لکھنے کی عادت ہی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو کوئی بات نہیں۔ عادت نہیں تو نہ سہی، مجھے تو لکھا ہوتا۔''

اس پر وہ مسکرانے لگا اور بولا۔ ''اب جو مل گئے تو سارے خط زبانی سنا دوں گا لیکن اس وقت مجھے دیر ہو رہی ہے مجھے اسٹرپٹو مائی سین کا پرمٹ لینا ہے اور دفتر ابھی بند ہو جائیں گے۔''

''اسٹرپٹو مائی سین کا پرمٹ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں!'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''ڈاکٹر نے یہی دوا تجویز کی ہے۔۔۔ اور یار! اچھا بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے اپنا پتہ بتا دو۔''

میں نے ڈائری سے ایک ورق پھاڑ کر اس پر اپنا پتہ لکھ دیا اور اس کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا نقشہ بنا کر بھی اُسے سمجھا دیا کہ صدر ٹرام جنکشن کے سامنے جو کھلی سڑک ہے، اس کے پہلے بائیں موڑ پر ایک مسجد ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک لائبریری ہے اور لائبریری سے چند قدم کے فاصلے پر دائیں ہاتھ کو بنجارا ہوٹل ہے۔ میں اُس کے آٹھویں کمرے میں رہتا ہوں۔'' زماں چلنے لگا تو میں نے کہا۔ ''یار تمھارے چلے جانے کے بعد سیما بھی اچانک غائب ہو گئی اور اُس کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔''

''اچھا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا اور بولا۔ ''یار یہ لڑکیاں بھی عجیب بادشاہ ہوتی ہیں کہ وقتے بہ سلامے بر نجند گاہے بدشنامے خلعت وہند، لیکن یار! اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں شام کو آؤں گا۔ پانچ چھ

بجے میرا انتظار کرنا۔"

وہ چلا گیا۔ "میں نے سائیکل کا تالا کھولتے ہوئے سوچا۔ اسٹر پٹو مائی سین، بادشاہ لڑکیاں، یہ کیا بات ہوئی؟

زماں اور میں تین سال تک اکٹھے ایک ہی کالج اور ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہے تھے۔ تین سال کی اس چھوٹی سی مدت میں اس نے مجھے کس کس طرح تنگ کیا، میں بیان نہیں کر سکتا۔ ظالم کا ذہن اچھا تھا۔ امتحان کے قریب آ کر چند دن پڑھائی کرتا تھا اور پاس ہو جاتا تھا۔ مجھے شروع سے رٹنے کی عادت تھی۔ لنگر لنگوٹے کس کے آدھی آدھی رات تک رٹا لگایا کرتا۔ وہ اپنے بستر میں لیٹے لیٹے سگریٹ پیتے ہوئے مجھے اس طرح جاپ کرتے دیکھ کر بہت ہنستا اور اونچے اونچے پشتو کے شعر گانے لگتا۔ بے حد ضدی اور سر پھرا قسم کا آدمی واقع ہوا تھا۔ جو بات جی میں آئی، بے سوچے سمجھے کہہ دیتا۔ تمیز کے نام سے بہت چڑتا تھا۔ مانگنا اُس کے مذہب میں حرام تھا۔ کسی بات پر منہ سے نہ نکل گئی تو اس کا "ہاں" میں تبدیل ہونا ممکنات میں سے نہیں تھا۔ تاش کبھی شرط باندھے بغیر نہیں کھیلتا تھا اور اگر ہارنے والے کے پاس پیسے نہ ہوئے تو اس کی کتابیں ضبط ہیں یا پتلون۔ اپنے پاس رقم نہیں تو کھیل میں شریک ہی نہیں ہوتا تھا۔ سگریٹ سلگانے کو ماچس نہیں تو مجھ سے کبھی نہیں مانگی۔ منہ میں سگریٹ دبائے چوس رہا ہے اور سر ہلا رہا ہے، میں نے چائے کی دو پیالیاں بنا کر کہا۔ "زماں بھائی! چائے پیو۔"

اُس نے آئینے میں اپنا مہاسا بلیڈ سے چھیلتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔"

میں نے کہا۔ "تھوڑی سی۔"

اس نے جواب دیا۔ "بھئی نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ بھئی نہیں کا کیا مطلب؟"

جھلا کر بولا۔ "بھئی نہیں کا مطلب یہ کہ نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "وجہ؟"

بولا۔ "نہیں"۔

میں نے پوچھا۔ "نہیں کیا۔"

کہنے لگا۔ "نہیں جو ہوتی ہے کہ بس نہیں۔"

ایسے آدمی کے ساتھ تین سال گزارنے جہنم ہیں کہ نہیں؟ باکسنگ میں یونیورسٹی چیمپئن شپ کا انعام

ملا تو اس بات پر اڑ گیا کہ انعام دینے والے سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ اپنی ہمت سے کپ لیا ہے، ہاتھ کیوں ملاؤں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ انعام لے کر ہاتھ ملائے بغیر واپس آ گیا۔ ڈاکیے نے ایک بیرنگ خط لا کر کہا۔

''دو آنے دیجیے۔''

اُس نے لفافہ دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''خط واپس کر دو، میں نہیں لیتا۔''

میں نے پوچھا تو بولا۔ ''دو آنے نہیں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یار مجھ سے لے لو، پھر لوٹا دینا۔''

پوچھنے لگا۔ ''کیوں لوں؟''

میں نے کہا۔ ''اس لیے کہ خط لے سکو۔''

بولا۔ ''نہیں، میں نہیں لیتا۔''

میں نے نہیں، کا لفظ سن کر کہا۔ ٹھیک ہے، شیروں کے پسر شیر ہی ہوتے ہیں جہاں میں۔ بھلا قبلہ گاہی کی طبیعت بھی ایسی ہی ہے؟ اس پر وہ ہنسنے لگا تو میں نے شیر ہو کر کہا۔ ''بلاؤں ڈاکیے کو؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور تاش پھینٹنے لگا۔

کالج میں جب فیس جمع کرانے کا دن آتا تو دفتر میں ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ لڑکیاں اس دھکم پیل میں فیس دینے سے گھبراتی تھیں۔ ان کی فیسیں لڑکے جا کر داخل کرواتے تھے۔ اس طرح ایک مہینے بعد ان سے کھل کر گفتگو کرنے کا اچھا خاصا موقع مل جاتا تھا۔ وہ اپنے پرس سے روپے نکالتیں اور گن کر کسی کلاس فیلو کو دے دیتیں۔ وہ انہیں گنتا اور یہ ضرور کہتا کہ ایک روپیہ کم ہے۔ اس طرح لڑکی اور لڑکے کے چہرے پر ایک ساتھ ایک سی دو مسکراہٹیں پھیل جاتیں۔ یہ فیس ادا کر کے پھر انہیں حساب دیا جاتا۔ ایک آدھ آنہ یہ کہہ کر رکھ لیا جاتا کہ یہ ہماری سگریٹ کے لیے ہے پھر وہ اکنی کئی دنوں تک اس لڑکی کے سفید چھلے کی طرح دکھائی دیتی رہتی۔ ہاسٹل میں کئی ایسے باندا ق لڑکے بھی تھے جن کے پاس بہت سی ایسی انگوٹھیاں جمع ہو گئیں تھیں۔ ہماری کلاس میں ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی کہ اس مرتبہ سیما اُسے فیس لے جانے کے لیے منتخب کرے، مگر وہ صرف سلیم کے ہاتھ اپنی فیس دفتر بھی بھجواتی۔ ایک مرتبہ سلیم نہیں تھا تو سیما نے زماں کو ستر روپے دے کر کہا۔ ''میری فیس داخل کروا دیجیے۔ زماں نے کچھ کہے بغیر روپے لے لیے اور سیدھا ہوٹل چلا آیا۔ سیما برآمدے میں گھنٹے بھر تک رسید کا انتظار کرتی رہی مگر رسید لانے والا تو اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دوسرے دن زماں نے اکہتر روپے سیما کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ ''کل مجھے نیند آ گئی اور میں فیس داخل

نہ کرواسکا۔ آپ اپنے روپے لے لیجئے اور یہ ایک روپیہ لیٹ فیس کا جرمانہ ہے۔" سیما نے کھینچ کر روپیہ دیوار سے دے مارا۔ زماں نے کہا۔ "ایسے تو نہیں ٹوٹے گا۔" اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کالج میں پروفیسر دیس راج سے اُس کی جان جاتی تھی۔ یہ پُرانی وضع کے معمر پروفیسر تھے۔ سفید پاجامہ، اچکن پہنے، ململ کی پگڑی باندھ کر کالج آتے، ایک ہاتھ میں بورڈ صاف کرنے کا ڈسٹر ہوتا اور دوسرے میں چاکوں کا ڈبہ۔ دونوں ہاتھ چاک کی سفیدی سے بھرے ہوتے اور اچکن پر بھی جگہ جگہ ان ہاتھوں کے نشان ہوتے۔ زمان کو وہ ہینگ والا کہا کرتے تھے اور یہ انہیں بجائے پروفیسر صاحب کے باباجی کہا کرتا۔ باباجی کے سامنے اُس نے کبھی سگریٹ نہیں پیا، اونچا نہیں بولا۔ ضد نہیں کی اور کسی بات سے انکار نہیں کیا۔

ڈائی نیمکس کی کاپیاں دیکھتے ہوئے وہ زماں کو بلاتے اور اُس کا کان پکڑ کر آہستہ آہستہ مسلتے جاتے اور کہتے جاتے۔ "یہ کیا کیا ہینگ والے! یہ کیا کیا۔" زماں کے منہ میں گھنگھنیاں بھری ہیں، آنکھیں نیچی ہیں، جواب دینے کی سکت نہیں۔ اسی طرح کمان بنا کھڑا ہے۔ اگلا صفحہ پلٹ کر باباجی اس کا کان چھوڑ کر پیٹھ ٹھونکتے اور خوش ہو کر کہتے۔ "میرا ہینگ والا ہے لائق، لیکن پاپی پڑھتا نہیں، مکے بازی پر جان دیتا ہے۔" پھر اس کی کاپی بند کر کے کہتے۔ "جا میرے لیے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا۔" اور زماں فخر سے سر اونچا کر کے دروازے کی طرف یوں بڑھتا جیسے کسی نے دو جہان کی دولت اُسے بخش دی ہو۔

ایک مرتبہ سیما اور ساوتری پتہ نہیں، کون سی کتاب لائبریری سے لینے گئیں تو لائبریرین نے انہیں بتایا کہ وہ کتاب تو دیر سے زماں صاحب کے پاس ہے۔ وہ سیدھی ہوسٹل پہنچیں، میں رٹا لگانے میں مصروف تھا اور زماں حسب معمول رضائی چوڑائی کے رُخ اوڑھے یوں ہی آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ سیما نے اندر آ کر کہا۔ "زماں صاحب! وہ کتاب آپ کے پاس ہے؟"

زماں نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ "اُس میز پر پڑی ہے۔" اور پھر کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کرلیا۔ میں اپنی چارپائی سے اُٹھ کر اُن کے ساتھ کتاب تلاش کرنے لگا لیکن وہ نہ ملی۔ سیما نے پھر کہا۔ "مسٹر زماں! کتاب یہاں تو نہیں ہے؟"

زماں نے اُسی طرح لیٹے لیٹے جواب دیا۔ "یہیں کہیں ہوگی۔ پرسوں تو اسی میز پر پڑی تھی۔" سیما اور ساوتری نے اس بدتمیزی پر احتجاجاً تلاش بند کردی اور منہ پھلائے چلی گئیں۔

میں نے کہا۔ "یار عجیب احمق ہو؟"

اس نے کہا۔ ''ہوں۔'' اور پھر سو گیا۔

ایک مرتبہ جب کالج ہال میں ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی تھی تو زماں بھی وہاں پہنچ گیا۔ سیما پانی کے جگ کے پاس کھڑی تھی۔ سلیم اپنا مکالمہ بول کر پانی سے حلق تر کرنے آیا تو سیما نے گلاس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اوں ہوں، باہر نل پر جا کر پانی پیجئے، پتہ نہیں، کیسے کیسے لوگ اس ایک ہی گلاس میں پانی پیتے گئے ہیں۔''
سلیم اُس کی ہمدردی سے بے حد مرعوب ہوا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں شکریہ ادا کر کے باہر نکل گیا۔

زماں نے کہا۔ ''مجھے بھی پیاس لگی ہے۔'' سیما نے پھر گلاس پر ہاتھ رکھ کر یہی کہا۔ زماں نے گلاس اُس کے ہاتھ سے کھینچ کر جگ سے پانی انڈیلا اور غٹ غٹ پی گیا۔ سیما نے کہا۔ ''ضدی کہیں کا۔''

زماں نے کہا۔ ''وہمی کہیں کی'' اور ایک مصنوعی ڈکار لے کر ہال سے باہر آ گیا۔ وائی، ایم، سی، اے، میں باکسنگ کا مقابلہ ہوا۔ ہمارے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے طلبہ بھی یہ مقابلہ دیکھنے آئے۔ زماں کا مقابلہ پنجاب رجمنٹ کے ایک کپتان سے ہوا۔ زماں ہار گیا۔ رنگ سے باہر نکل کر اُس نے سیما اور سلیم کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ ان کے قریب جا کر زماں نے سیما سے پوچھا۔ ''مقابلہ پسند آیا۔''

''بہت!'' سیما نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا ہی ہوا۔ آپ کا مان بھی ٹوٹا۔ اپنے آپ کو پتہ نہیں کیا جولائی سمجھے ہوئے تھے۔''

زماں نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔ ''مان ٹوٹا! میں کوئی ہارا ہوں؟''

پھر اس نے اپنے خون آلود منہ اور چہرے پر پڑے ہوئے نیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمغے کامیابی کے بغیر تو نہیں ملتے نا سلیم صاحب''، سلیم صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ وہ سیما کو لے کر جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر گیا۔

سردیوں کی ایک تیرہ و تار رات کو بارہ بجے کے قریب وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے سر اور بازو پر پٹیاں بندھی تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا۔ بتی جلنے سے میں جاگ اٹھا اور اُسے اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے رضائی پرے پھینک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں یار!'' اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبائی اور ماچس میز پر پہلو کے بل کھڑی کر کے دائیں ہاتھ سے اُس پر دیا سلائی رگڑنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''میں جلائے دیتا ہوں۔''

اس نے جھلّا کر کہا۔ ''آخر کیوں؟ کیا میں اپنی سگریٹ بھی خود نہیں سُلگا سکتا؟''

"تم زخمی کیسے ہو گئے؟"

میں نے پھر پوچھا۔ "جیسے ہوا کرتے ہیں۔ میں حملے کے جواب کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ مجھ پر ایک

اس نے ہنس کر کہا۔ "جیسے ہوا کرتے ہیں۔ میں حملے کے جواب کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ مجھ پر ایک دم پل پڑا اور چاقو سے کھچاک کھچاک کئی زخم لگا دیے۔ پھر میں پٹی کروانے اسپتال چلا گیا۔ اسی لیے تو مجھے دیر ہوگئی اور یار! آج دیر سے آنے پر جواب طلبی بھی ہوگی اور جرمانہ بھی۔"

میں نے پوچھا۔ "مگر وہ تھا کون؟"

"مجھے کیا خبر۔" اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "ایسی تاریک رات میں کہیں شکل پہچانی جاتی ہے۔"

"وہ کچھ بولا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بولا تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"میں نہیں بتاتا۔"

میں نے گالی دے کر کہا۔ "تو جہنم میں، تجھ سے پوچھتا ہی کون ہے؟"

اس پر وہ ہنسنے لگا اور تھوڑے وقفے کے بعد دیر تک ہنستا رہا۔ بتی بجھا کر اور اپنے بستر پر منہ سر لپیٹ کر میں جی ہی جی میں اسے گالیاں دیتا رہا۔ پھر میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھا۔ "یار! تم نے اس کی آواز بھی نہیں پہچانی؟"

اُس نے جھلا کر کہا۔ "چاچا! میں نے پہلے کبھی اُس کی آواز سنی ہوتی تو پہچانتا۔" پھر ہم میں سے کوئی نہ بولا۔

جب دوسرے دن کالج میں ہر ایک نے بار بار اُس سے رات کے حادثے کے متعلق پوچھنا شروع کیا تو اُس نے تنگ آ کر نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگا دیا کہ "پچھلی رات کسی شخص نے مجھے چاقو سے گھائل کیا۔ میں مقابلے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے گہرے زخم آئے۔ پٹی اُسی وقت کرا لی گئی، اب روبصحت ہوں۔ براہِ کرم کوئی صاحب میری روداد نہ پوچھیں۔ میں اپنی داستان سنا سنا کر تھک گیا ہوں۔" اس کے نیچے اس نے موٹے حروف میں "زماں خاں بقلم خود" لکھ دیا۔

اسی شام میں اُسے سائیکل پر بٹھا کر پٹی کروانے اسپتال لے جا رہا تھا کہ راستے میں سیما مل گئی۔ اس نے ہمیں روک لیا اور زماں سے کہنے لگی۔ مسٹر زماں! میں نے آج آپ کو پٹی باندھے دیکھا تھا لیکن

اس کے متعلق پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ کالج سے گھر لوٹتے ہوئے آپ کا اعلان پڑھا تو میرا جی بھی آپ کو خط لکھ دینے کو چاہا۔ بتائیے کیا ہوا تھا؟

زماں نے سائیکل کی گدی پر ٹیک لگا کر کہا۔ ''کوئی گیارہ بجے کے قریب جب میں اپنے کالج کے پچھواڑے آموں والی سڑک پر جا رہا تھا تو کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں رُک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ متوسط قد کا ایک آدمی کمبل پہنے میرے پاس آیا۔ ذرا سی دیر رکا اور پھر ایک دم خنجر سے مجھ پر وار کیا جو میرے بائیں کندھے میں لگا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کو ہٹ کیا مگر چونکہ میرا کندھا زخمی ہو گیا تھا۔ اس لیے ضرب ٹھیک سے نہیں لگی۔ اُس نے نیچے گرا لیا اور پوچھا۔ کیا تم سیما سے محبت کرتے ہو؟ میں نے کہا۔

''ہاں۔''

سیما نے تنک کر پوچھا۔ آپ نے یہ کیوں کہا؟

''وہ اس لیے'' زماں نے گھنٹی پر انگلی بجاتے ہوئے کہا۔ ''کہ اگر میں نہیں کہہ دیتا تو وہ چھوڑ دیتا اور سمجھتا کہ میں نے صرف جان بچانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ پھر اُس نے خنجر اوپر اٹھا کر کہا۔ اس کا خیال چھوڑ دو، نہیں تو تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔ میں نے جواب دیا کہ میں جان سے جائے بغیر اُس کا خیال کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ کہتے ہی میں نے پوری طاقت سے اُسے پرے دھکیلا اور وہ دور جا گرا۔ سامنے کے چوبارے کی بتی جلی اور وہ بھاگ گیا۔''

سیما اس کا جواب دیے بغیر تیز تیز آنکھوں سے اُسے گھورتی ہوئی آگے چلی گئی۔

راستے میں مَیں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے یہ بات مجھے کیوں نہ بتائی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''چونکہ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا، اس لیے۔''

اس واقعے کے تھوڑے عرصے بعد مارچ کے مہینے میں ایک اور عجیب واقعہ رونما ہوا۔ اس وقت ہم لوگ اپنے کمروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر اندر ہی سوتے تھے۔ آدھی رات کو کسی نے ہمارے کمرے کے دروازے سے لگ کر سوئے ہوئے زماں پر پستول سے دو فائر کیے۔ ٹیبل لیمپ کا شیڈ ٹوٹ گیا اور میز پر پڑی ہوئی آکسفورڈ ڈکشنری کے بہت سے اوراق گولی چاٹ کر نکل گئی۔

چند دن بعد زماں ہوسٹل سے چلا گیا۔ پھر اُس نے کالج آنا بند کر دیا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ آج پورے بارہ سال بعد اُسی زماں نے کافی ہاؤس کی سیڑھیوں کے نیچے میری آنکھیں ہاتھ سے ڈھانپ کے گویا پوچھا تھا۔ ''میں کون ہوں؟''

مَیں بنجارا ہوٹل میں دیر تک اُس کا انتظار کرتا رہا۔ سات بج گئے مگر وہ نہ آیا۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ ہوٹل کے پھاٹک پر زماں ایک بیرے سے میرا پتہ پوچھ رہا تھا۔ میں لپک کر اُس کے پاس پہنچا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

گھنٹی بجا کر میں نے بیرے کو بلایا اور زماں سے پوچھا۔ چائے پیو گے؟

''نہیں۔'' اُس نے منہ پھاڑ کر جواب دیا۔

''آخر کیوں؟''

''بس نہیں۔''

جب اُس نے ''بس نہیں'' کہا تو میں نے بیرے سے کہا۔ ''جاؤ کوئی کام نہیں۔''

میں نے زماں کے قریب کرسی کھینچ کر اُسے پھر وہی خبر سنائی کہ اس کے چلے جانے کے بعد سیما کہیں روپوش ہو گئی اور آج تک اُس کا کوئی کھوج نہ مل سکا۔

'لیکن وہ گئی کہاں یار؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''اس کے ماں باپ نے تلاش بھی نہ کی۔''

''کی بھائی! بہت کی مگر اس کا پتہ ہی نہ چلا۔''

''کمال ہے۔'' اس نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک بیڑی نکالی اور چوسنے لگا۔ پھر میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا۔ ''جس رات مجھ پر کسی نے گولی چلائی۔ اُس سے اگلے دن سیما مجھے لائبریری میں ملی۔ اس نے مجھے کہا کہ میں شام کو اسے آرام باغ میں ملوں۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی اس نے اتنا کہا کہ شام کو بتاؤں گی، شام کو ہم کرکٹ گراؤنڈ سے پرے درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گئے۔ سیما نے کہا۔ زماں! اگر میں تم سے ایک چیز مانگوں تو دو گے؟ میرے منہ سے پتہ نہیں کیوں ضرور نکل گیا۔ اُس نے روہانسی ہو کر کہا۔ مجھے اپنی زندگی دے دیجئے۔ میں نے بازو پھیلا کر جواب دیا لے لو۔ اس نے کہا میں اُسے لے جا کر جہاں چاہوں رکھوں؟ میں نے کہا۔ جو چیز تمہاری ہے، اس کے رکھ رکھاؤ میں دخل دینے والا میں کون؟ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔ یہاں سے چلے جائیے اپنے گاؤں یا کہیں اور۔ وہ لوگ آپ کو مار ڈالیں گے۔۔۔ آپ کو۔۔۔ آپ کو۔۔۔ پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میں نے کہا۔ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ میرے حملہ آور سمجھیں گے، میں ڈر کر بھاگ گیا ہوں۔ میرے دوست کہیں گے، میں بزدل تھا اور باکسنگ میں مجھ سے ہارے ہوئے میرے حریف کہیں گے۔ وہ اب ہوتا تو۔۔۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا سیما! خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے۔ تم مجھے

اس بات پر مجبور نہ کرو۔ اُس نے کہا۔ تم نے وعدہ کیا تھا اور میں نے اس کی شہ پر اتنی سی چیز کی فرمائش کی ہے۔ اب تم اس چیز پر اپنا وعدہ قربان کر رہے ہو۔ میں نے تو سنا تھا کہ تمہارے وعدے کبھی نہیں ٹوٹتے۔ میں نے سیما سے وعدہ کر لیا تھا کہ اپنے گاؤں تو نہ جاؤں گا پر بمبئی چلا جاؤں گا۔ وہاں میری برادری کے چند افراد سودی روپے کا لین دین کرتے تھے۔ میں تمہیں بتائے بغیر اُن کے پاس پہنچ گیا۔ دن رات مجھے ایک یہی خیال کھائے جا رہا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ موت سی چیز سے ڈر کر بھاگ گیا۔ میں نے سیما کو ایک خط لکھا کہ بمبئی کی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں اور واپس آنا چاہتا ہوں۔ اب مجھے اپنے وعدے کا ذرا بھی پاس نہیں۔ اگر زندگی میں ایک وعدہ ایفا نہ ہو سکا تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ میں تمہارے خط کا ایک ہفتے تک انتظار کروں گا اور اس کے بعد میں پھر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ چار دن گزر گئے خط نہ آنا تھا نہ آیا۔ پانچویں دن سیما خود میرے پاس پہنچ گئی۔ اُس نے مجھے کالج کی کتنی ہی دلچسپ خبریں سنائیں۔ تمہارے متعلق بتایا کہ تم نے ایک نیولا پال لیا ہے اور اسے چھپا کر کلاس میں لے آتے ہو۔ باباجی کے بارے میں بتایا کہ میرا نام لے کر بار بار کہتے ہیں کہ وہ پاپی بہت یاد آتا ہے۔ پتہ نہیں، کہاں چلا گیا۔ خدا جانے ہم کو بھی یاد کرتا ہے یا نہیں۔ پھر سیما نے کہا کہ میں اس لیے آئی ہوں کہ تم اپنا وعدہ نبھا سکو۔ اب میں عمر بھر تمہارے ساتھ رہوں گی اور تمہیں اپنے قول پر قائم رکھوں گی۔''

''مجھے کسٹم میں ایک معمولی سی نوکری مل گئی اور بھنڈی بازار کی اسی کھولی میں ہماری شادی ہو گئی لیکن یار وہ بجھی بجھی سی رہتی اور جب میں دفتر میں ہوتا تو روتی بھی رہتی۔ شام کو اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی ہوتیں اور وہ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹیں پھیلا پھیلا کر مجھ سے باتیں کرتی۔ پھر ایک دن پتہ نہیں اُسے کیا ہو گیا کہ میرے پیچھے پڑ گئی کہ بمبئی چھوڑ کر کہیں اور دور نکل چلو۔ یوں تو یار میں رات کو اُس کے ساتھ تاش کھیل کر اس کے سارے روپے جیت لیا کرتا تھا اور کبھی واپس نہ کرتا۔ پر مجھے اُس کے دل کا بڑا خیال تھا۔ اینگلو ایرانین آئل کمپنی میں مستریوں کی جگہ خالی تھی۔ میں نے عرضی دے دی۔ انتخاب ہوا اور ہم آبادان پہنچ گئے اور یار اب آبادان کی باتیں سناؤں گا تو رات بیت جائے گی مگر کہانی ختم نہ ہوگی۔ وہاں باکسنگ اور ڈائی نیمکس نے بڑا کام دیا۔ مائیکل صاحب ہر مہینے باکسنگ کا ایک مقابلہ کراتے اور میری گیم ضرور دیکھتے۔ ایک سال کے اندر اندر میں ڈپٹی انجینئر ہو گیا۔ سیما کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ اس نے ساری ہندوستانی اخباریں اور رسالے اپنے نام جاری کرا رکھے تھے۔ اپنے بنگلے کے باغیچے میں بید کی کرسی ڈال کر دیر تک مطالعہ کرتی رہتی۔ مستریوں اور فٹروں کی بیویاں اور بچے اس کے گرد گھیرا ڈالے اُسے طرح طرح کی باتیں سنایا کرتے۔ اس

"آپ ٹرانس کرپشن سے لیں مسعود صاحب، ان کے پاس خان صاحب کا دو گھنٹے کا پروگرام محفوظ ہے۔ ایک افسانہ پڑھا ہے انہوں نے اپنی آواز میں اور میری اپلی کیشن کو ایسے نہیں پھینک دینا مسعود صاحب میں نے ایک کاپی ڈائریکٹ اسی لیے آپ کے نام بھیجی ہے۔"

"وہ بھی ہو جائے گا میاں، یہ کوئی وقت ہے۔ تم بس ایک پروگرام کر دو، اچھا سا یادگار، ہمارا یار تھا، اس کے لیے اتنا بھی نہ کر سکے تو پھر لعنت ہے ہم پر۔"

"آپ بے فکر رہیں جی، ایک مرتبہ تو لوگوں کے آنسو نکل آئیں گے۔"

"شاباش، لاہور سٹیشن کی روایت قائم رہنی چاہیے۔۔۔ اچھا بھئی۔"

"ایک منٹ سر۔۔۔ مسعود صاحب۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہاں جی۔۔۔ نیوز میں اشفاق صاحب کی خبر آ رہی ہے یا نہیں۔"

"آ رہی ہے، آنی کیوں نہیں تھی یہ اس کا حق ہے، نیشنل نیوز بلٹن میں آئے گی۔۔۔ جی ایم اس کا یار ہے۔ اس نے بڑی اچھی سٹوری بنائی ہے، بہت رو رہا تھا بیچارہ۔"

خان صاحب تو اس کے شاگرد بھی رہے ہیں شاید۔

"شاگرد کیا، وہ بھی ٹھیک ہے، لیکن بڑے گہرے دوست تھے۔ قلبی، نہایت قریبی، اچھا بھئی۔"

"اچھا سر خدا حافظ۔"

پھر اکرم بٹ کو ریاض محمود کو، ظہیر صدیقی کو اور قدیر ملک کو پروگرام تیار کرنے کی بھسوڑی پڑے گی۔ جب وقت کم ہو اور پروگرام زیادہ فیڈ کرنا ہو تو ہمیشہ مشکل پڑ جایا کرتی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کافی پریشان ہوں گے اور لوگوں کی بے وقت موت پر ہم اسی طرح پریشان ہوا کرتے تھے۔ صوفی تبسم بیچارے سمن آباد ہی میں رہتے ہیں اس لیے صوفی صاحب کو لانے والی گاڑی انہیں بھی ساتھ ہی لیتی آئے گی۔ اے حمید بھی سمن آباد رہتا ہے، لیکن جب وہ یہ خبر سنے گا تو دُکھ سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا اور وہ رسمی گفتگو کرنے پر لعنت بھیجتا ہوا آنے سے انکار کر دے گا اور پھر وہ اور ریحانہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر ان دنوں کو یاد کرنے لگیں گے جب قدسیہ اور میں پہلی مرتبہ ان کے گھر پرانی میوہ منڈی کے قریب گئے تھے۔ بانو نے ریحانہ سے ان چھوٹی چھوٹی پیالیوں کی بڑی تعریف کی تھی جن میں اے حمید نے ہمیں کشمیری چائے پلائی تھی اور اے حمید نے الماری سے ساری پیالیاں نکال کر انہیں اخباری کاغذوں میں لپیٹ کر بانو قدسیہ کے حوالے کر دی تھیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا، بس بس اب بولیں نہ بالکل، اور بانو نے بھرائی ہوئی

آواز میں شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

آفتاب احمد کو جب ٹیلی فون پر یہ دلدوز خبر ملے گی تو وہ جی بھر کے روئے گا اور پھر رات بھر روتا ہی رہے گا۔ اس شام ضرور کوئی اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے گھر چھوڑنے جائے گا۔ پتہ نہیں آفتاب کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ بات بے بات رونے لگتا ہے اور اس کی آنکھیں ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ پھر میرا گزر جانا تو اس کے لیے قیامت سے کم نہ ہوگا۔ محمد حسین کے فوت ہونے پر اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی اور دوسرے بہت سے لوگوں کی آرزو ہوگی کہ ٹی وی پر جو پروگرام ہو، وہ قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جائے، لیکن دوسرے لوگوں کو اس میں تامل ہوگا۔ اصل میں وہ اس تامل میں حق بجانب ہوں گے۔ ایک علاقائی ادیب یا علاقائی ٹی وی شخصیت کو دوسروں پر ٹھونسنا مناسب بھی نہیں۔ اس سے ایک پریسی ڈینٹ قائم ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرے علاقوں کے لوگ تقاضا کریں گے کہ اشفاق نیشنل فگر تھا، اس لیے اس کا پروگرام جائز طور پر قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جانا چاہیے۔ دوسرے لوگ جوان سے اتفاق نہیں کریں گے، اپنی دلیل میں شدت اختیار نہیں کر سکیں گے کیونکہ ہمارے یہاں مرے ہوئے آدمی کو شدت سے کنڈیم کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ آخر فیصلہ یہ ہوگا کہ 9 بجے والی خبروں کی تصویری جھلک میں ذرا سا حصہ اس پروگرام کا بھی دکھا دیا جائے جو لاہور ٹی وی نے میری یاد میں کیا تھا۔ یہ فیصلہ ہو چکنے کے بعد بھی میرے حامی باہر لان میں اندر کوری ڈور میں کافی دیر تک یہ کہتے پھریں گے۔ یہ سب ''اس۔۔۔ حرامی کی شرارت ہے۔ جب وقت پڑتا تھا تو کیا دست بستہ سکرپٹ لینے اور ڈرامہ لکھوانے چلا جایا کرتا تھا اور اب انکاری ہو گیا ہے۔''

اُردو بورڈ کے ملازمین بھی یہ خبر سن کر سکتے میں آ جائیں گے۔ ربانی کا، فضلی کا اور سلطان صاحب کا برا حال ہوگا۔ شریف دین غمزدہ ہوگا۔ لیکن اس کو فکر ہوگی کہ یہ خبر تمام اخباروں میں نمایاں جگہ پر لگ جائے۔ اس کے پاس چونکہ میری پاسپورٹ سائز کی بہت تصویریں مختلف پوزوں میں ہیں، اس لیے وہ دفتر پہنچ کر اپنی الماری سے مختلف تصویریں نکالے گا اور ان کی پشت پر اپنی منحنی لکھائی میں اخباروں کے نام لکھے گا۔ اُردو اور انگریزی میں سانحہ جانکاہ کا مضمون بنا کر انہیں نفاست سے ٹائپ کرے گا اور اپنے پلے سے رکشا لے کر پہلے سیدھا فضلی کے گھر جائے گا اور پھر وہ دونوں اخباروں کے دفتروں کے چکر لگائیں گے۔

امجد حسین کو فکر ہوگی کہ یہ خبر چوکھٹے کے اندر چھوٹی تصویر کے ساتھ فرنٹ پیج پر آئے۔ اگر ادریس وہاں ہوا تو وہ ضرور دے گا کہ نیوز کم از کم دو کالمی ہونی چاہیے۔ انور آرٹسٹ اگر اتفاق سے دفتر میں ہی ہوا تو وہ ادریس کی تائید کرے گا۔ شاہ جی نیوز تیار کریں گے۔ بائیوڈیٹا شریف الدین اور فضلی فراہم کریں گے۔

میٹر کمپوز ہو جائے گا، لیکن اسلام آباد سے اکونومک کونسل کی ایک خبر آ جانے پر مجبوراً میری خبر کو اخبار کے آخر میں دینا پڑے گا۔ آخری وقت میں میک اپ کے وقت پھر مشکل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ تیسری دنیا کی ایک خبر جو بیک پیج پر کیری اوور ہو رہی ہو گی، وہ میرے لیے وقف جگہ پر حق شفع کر دے گی اور امجد حسین جھلا کر اور مجبور ہو کر میری خبر کو اندر تیسرے صفحے پر لے جانے پر مجبور ہو جائے گا۔

رات کو جب ریڈیو پر میرے انتقال کی خبر نشر ہو گی، تو پتوکی، جھنگ، ساہیوال، موڑ کھنڈا، عبدو کے، علی اولک وغیرہ کے لوگ کہیں گے، لو جی ایہہ وی ختم ہو گیا۔ بڑا اسیانا بنداسی، کیا تلقین شاہ دا روپ بھریا سی، اور بڑی بوڑھیاں یہ خبر سن کر کہیں گی ''بابا تلقین شاہ'' فوت ہو گیا اے، ہن ایہہ پروگرام کون کریا کرو؟''

حیدر علی نمبر دار کہے گا ''ہن اسیں کی دسیے، ایہہ گورنمنٹ دے کم این جدھی مرضی ڈیوٹی لگا دیوے۔''

''ٹھیک اے نمبر دار کم تے چلدے ای رہنے ایں، انج بڑا اسیانا بابا سی۔''

رات کو جب ٹی وی پر خبرنامہ میں یہ خبر نشر ہو گی تو بڑے لوگوں کو صدمہ ہو گا۔ بہت سے ناظرین آرزومند ہوں گے کہ میرے کسی پرانے پروگرام کی ایک جھلک دکھائی جائے۔ خاص طور پر ''نکھار'' پروگرام کی جس میں مہمان امانت علی ہے اور میزبان میں ہوں۔ ٹیلی ویژن والوں کو اس کوتاہی پر ناظرین اپنے اپنے گھروں میں نکتہ چینی بھی کریں گے، لیکن پھر دوسری باتوں میں الجھ جائیں گے۔ کچھ گھروں میں جہاں لکھنے لکھانے اور ٹی وی پروگراموں میں شرکت کا کام ہوتا ہے۔ میری موت پر افسوس کا اظہار کیا جائے گا کہ وہ ایک اچھا انسان تھا، لیکن اچھا انسان نہیں تھا۔

ٹی وی پر نیوز سننے کے بعد کچھ لوگ گہری سوچ میں ڈوب جائیں گے کہ دیکھیں اب اُردو بورڈ کی ڈائریکٹری کس کو ملتی ہے۔ ان میں سے چند ایک کی بیویاں کہیں گی ''اب انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہ چانس آپ کو ملنا چاہیے۔ آخر آپ نے ساری عمر اُردو کی خدمت کی ہے اور اس زبان سے محبت کی ہے۔''

خاوند ٹھنڈی سانس بھر کر کہے گا، بیگم کل خدمت اور محبت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ سب کانٹیکٹس کی بات ہے اب مرحوم کو اُردو سے کہاں محبت تھی اور اس نے کس طرح سے اس زبان کی خدمت کی تھی۔ یہ تو تعلقات کی بات ہے۔''

بیوی کہے گی، لیکن ڈرامے بڑے اچھے لکھتا تھا اور باتیں بھی بڑی مزیدار کرتا تھا۔

''بالکل ٹھیک ہے، میاں ایمانداری کے ساتھ جواب دے گا۔ اس کے ہم بھی معترف ہیں، لیکن اس

کے لیے اُردو بورڈ کی ڈائریکٹری کہاں تک جائز ہے؟ یہ سوال ہے جو معاشرے کے حاکمانہ وقت سے پوچھا جانا چاہیے۔ یہ سب دھاندلیاں ہیں بیوی اور اس دور میں صحیح لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔''

پھر بڑی دیر تک بڑے گھروں میں اُردو بورڈ کی ڈائریکٹری کا ذکر ہوتا رہے گا۔ کچھ ایسے لوگوں کو یاد کرنے کی کوشش ہوگی جن کے براہ راست حفیظ پیرزادہ سے تعلقات ہوں۔ ایک آدھ ٹیلی فون پی آئی اے کے دفتر بھی ہوگا کہ صبح پہلے جہاز سے اسلام آباد کے لیے سیٹ مل سکتی ہے یا نہیں۔

اس اک ذرا سی خبر سے گھر میں کہرام ہوگا۔ ادبی حلقوں میں محتاط تنقید ہوگی۔ ریڈیو سننے والے دیہاتی حلقوں میں غم ہوگا۔ دوستوں کے درمیان آئیندہ کی فکر ہوگی۔ علمی حلقوں میں ہلچل اور منصوبہ بندی ہوگی۔ اُردو بورڈ کے ملازمین کو تشویش ہوگی پھر صبح ہوگی اور دکانیں کھلنے لگیں گی اور لوگ دفتروں کو جانے لگیں گے اور بچے مدرسوں کے لیے تیار ہوں گے اور عورتیں منہ دھونے لگیں گی۔

شاہ عالمی میں ایک کراکری مرچنٹ اخبار ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھی دکاندار کے پاس جا کر کہے گا، یار یہ دیکھا تم نے ''تلقین شاہ'' مر گیا بیچارہ۔''

''کب؟'' ساتھی دکاندار بھونچکا ہو کر پوچھے گا۔

''تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ یہ دیکھو اس کی تصویر۔ ایک مرتبہ آئے نہیں تھے ہماری دکان پر سلور کی چلمچی خریدنے وہ اور اس کی بیوی۔''

''وہ اس کی بیوی تھی نیلے سوٹ والی۔''

ہاں، وہ بھی ڈرامے لکھتی ہے۔ اس نے ٹیلی ویژن پر گھوڑے والا ڈرامہ لکھا تھا۔

وہ تو اس کا ڈرامہ تھا تلقین شاہ کا اپنا۔ اس کی بیوی کا دوسرا تھا جس میں ایک آدمی خفیہ طور پر دوسری شادی کر لیتا ہے اور پانچ چھ سال تک اس کے بیوی بچوں کو علم ہی نہیں ہوتا۔'' بڑا ظلم ہوا یار، ابھی تو جوان ہی تھا، پچاس سال کا بھی نہیں تھا۔''

پاکستان میں اتنی عمر ہی ہوتی ہے شیخ صاحب، پچاس سال کا آدمی دوسرے کنارے پر لگ جاتا ہے کوئی قسمت والا ہی دس سال اوپر گزارتا ہے پہلے زمانے میں عمریں کافی لمبی ہوتی تھیں۔ اس زمانے کی خوراکیں بھی تو دیکھو، خالص گھی آٹا، دودھ، دہی، لسی، سادہ غذا، شیر ببروں جیسے لوگ ہوا کرتے تھے، کیا مرد کیا عورتیں۔

ولیت کے لوگ تو اب بھی لال سرخ ہوتے ہیں۔

وہاں بے فکری ہے بھا جی، کوئی بے ایمانی نہیں، رشوت نہیں، بک بک نہیں، سب کام سرکار کرتی ہے۔لال سرخ تو آپ ہی ہونا ہوا۔

وہ میم پھر نہیں آئی پرانے سیٹ خریدنے والی۔

کمینی ہے سالی، آئی تھی ٹوٹی ہوئی پیالی لے کر، کہنے لگی تم نے ٹوٹی ہوئی پیالی رکھ دی پیکنگ میں اس کو تبدیل کرو۔

تم نے انکار کر دینا تھا۔

''کوئی دیسی عورت ہوتی تو میں انکار بھی کر دیتا۔ ہمارے ملک کا سوال تھا۔ میں نے کہا لاؤ میم صاحب پیالی تبدیل کر دیتے ہیں۔ پاکستان کے سارے دکاندار ایسے نہیں ہوتے، ہم لوگ دیدوالے ہیں، مہمان نواز ہیں۔''

''بڑے مہمان تھے بھئی سبحانی کے لڑکے کی شادی پر، کوئی ہزار بارہ سو عورتیں بچے ملا کر۔''

بلیک کی یہی تو برکت ہے شیخ صاحب، ایک نانواں، دوسرے عزت، تیسرے تعلقات۔

ہم نے بلیک نہ کر کے کیا بنا لیا۔

''کچھ نہیں جی کچھ نہیں، ایسے ہی مر جائیں گے دس دس جوڑتے۔''

اس کے چند گھنٹوں بعد دوستوں کے درمیان ٹیلی فون پر باتیں ہوں گی۔ مجھے یاد کیا جائے گا۔ ہر کوئی مجھ سے قریب تر ہونے کا دعویٰ کرے گا اور دوسرے کو خفیف کرے گا کہ باوجود مجھے اچھی طرح جاننے کے وہ اتنا نزدیک نہیں تھا۔ تابش کے بال اور پھول جائیں گے۔ آنکھیں اور خاموش ہو جائیں گی۔ زبان بالکل گنگ ہو گی۔ ریاض محمود اپنا زرعی پروگرام ریکارڈ کرنے کے لیے سٹوڈیو میں موجود ہو گا اور انجینئروں کی خوشامد کر رہا ہو گا۔ ''تلقین شاہ'' لکھنے والے کا پیسٹ ہاف سیٹ چائے میں سے تین پیالیاں نکال کر ''کے ٹو'' سگریٹ پی رہے ہوں گے اُردو بورڈ کا عملہ پریشان ہو گا کہ اگلی تنخواہ کے لیے پے بلوں پر کون دستخط کرے گا۔ پھر ان میں سے دو تین مل کر اکاؤنٹنیٹ کے ساتھ بینک جائیں گے اور وہاں سے فارم لیں گے کہ ڈرائنگ اور ڈسبرسنگ آفیسر کے فوت ہو جانے کی صورت میں منسٹری کے سیکرٹری کے دستخط کیے جائیں اور تنخواہ نکالی جا سکے۔ پھر اُردو بورڈ کے ملازمین شریف الدین کو شام کی گاڑی سے اسلام آباد روانہ کریں گے تاکہ وہ ڈاکٹر اجمل کے پے سی من سگنیچر لا سکے اور بینک سے تنخواہ ڈرا کی جا سکے۔ بیچاروں کو کافی تردد کرنا پڑے گا، لیکن شریف الدین کی حکمت عملی سے مشکل راہیں آسان ہو جائیں گی اور ان کو وقت پر

تنخواہ ملنے کی اُمید بندھ جائے گی۔ اس اُمید بندھنے کے بعد جب انہیں اطمینان ہو جائے گا تو وہ مجھے یاد کریں گے۔ فضلی ربانی، محمد علی، سلطان صاحب، طاہر اور بابو خان دل کھول کر مجھے یاد کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اپنے ساتھیوں کے خوف سے کچھ تعریف نہ کر سکیں گے کیونکہ ان پر مرحوم ڈائریکٹر کے پٹھو ہونے کا الزام لگ جائے گا اور نئے آنے والے ڈائریکٹر سے ان کی شکایت ہو جائے گی کہ یہ پرانے ڈائریکٹر کو دل سے چاہتے تھے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور ذہین فنکار اور شومین بزنس کے ایک کامیاب آرٹسٹ کی موت کے باوجود لاہور کا سارا کاروبار نارمل طریق پر چلتا رہے گا۔ شاہ عالمی چوک سے لے کر میو ہسپتال کے چوک تک ٹریفک اسی طرح پھنسا رہے گا۔ کوچوان گھوڑوں کو اونچے اور قریب کوچوان کو نیچے لہجے میں گالیاں دیتے رہیں گے۔ ہسپتال کے اندر مریضوں کو کھانا جاتا رہے گا۔ ٹیلی فون بجتا رہے گا، بجلی کا بل آتا رہے گا، فقیر سوتا رہے گا، چوڑھے ٹاکی مارتے رہیں گے، اُستاد پڑھاتے رہیں گے، ریکارڈنگ ہوتی رہے گی، قوال گاتے رہیں گے، رنڈی ناچتی رہے گی، ڈاکیا چلتا رہے گا، سوئی گیس نکلتی رہے گی، تقریریں ہوتی رہیں گی، غزلیں لکھی جاتی رہیں گی، سوئی میں دھاگہ پڑتا رہے گا، قتل ہوتا رہے گا، زچہ مسکراتی رہے گی، بچہ پیدا ہوتا رہے گا۔

برانڈرتھ روڈ کی دکانوں پر نئے مکان بنانے والی بیگمات ولیتی ٹونٹیوں اور فلشوں کے نمونے دیکھ رہی ہوں گی۔ ان کے پرسوں میں سو سو کے نوٹ ہوں گے اور ان کے خاوند اپنے اپنے مرکزوں پر روپے بنا رہے ہوں گے، کرشن نگر کی لڑکی میں ساری رات لگا کر باریک باریک لفظوں کی کشیدہ کاری سے ایک محبت نامہ لکھا ہوگا اور ہسٹری کی کتاب میں رکھ کر برقع اوڑھ کر اسے پوسٹ کرنے جا رہی ہوگی۔ شادماں کی لڑکی ٹیلفون پر اپنے محبوب سے گفتگو کر رہی ہوگی اور آپریٹر درمیان میں سن رہا ہوگا۔ موچی باہر بڈھے گھوڑوں کے نعل لگا رہے ہوں گے اور گھوڑا ہسپتال میں نوعمر بچھڑے آختہ کیے جا رہے ہوں گے۔ بڈھے عرضی نویس کا پیشاب بند ہوگا اور اس کے پوتے اسے چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لائے ہوں گے۔ خزانچی نوٹوں کی گٹھیوں میں سوراخ کر کے دھاگے پرو رہے ہوں گے۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے مائیں لڑکیوں سے پوچھ رہی ہوں گی کہ ان کے لیے کونسی تاریخ ٹھیک رہے گی۔ چلہ کاٹنے والے دُعائے حزب البحر پر داہنے ہاتھ کی انگلیاں کھول کر اوپر کی طرف اٹھا رہے ہوں گے۔ لڈو بناتا ہوا حلوائی اُٹھ کر سامنے والی نالی پر پیشاب کر رہا ہوگا۔ لبرٹی مارکیٹ میں دو جوان ایک لڑکی کے پیچھے گھوم رہے ہوں گے۔ دلہنوں کے

جسموں سے آج ایک اجنبی مہک بھی اُٹھ رہی ہوگی۔ بچے گلی میں کیڑی کاڑا کھیل رہے ہوں گے اور قریبی مکان میں ایک ماں اپنے بچے کو پیٹ رہی ہوگی، جس کا خاوند ایک عورت کے ساتھ جہانگیر کے مقبرے کی سیر کر رہا ہوگا۔ یونیورسٹی میں لڑکیاں کھلے پائنچوں کی شلواریں پہن کر لڑکوں سے یونین کی باتوں میں مصروف ہوں گی اور ہیلتھ سیکرٹری لاٹ صاحب کے دفتر میں اپنی ریٹائرمنٹ کے خوف سے یرقانی ہو رہا ہو گا۔ کچھ جسم ماربل کے باتھ روم میں واش کر رہے ہوں گے۔ کچھ چپس کے غسل خانوں میں نہا رہے ہوں گے۔ کچھ مسجدوں کے سقادوں میں پاک ہو رہے ہوں گے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ایک ادیب اور فنکار کے ساری عمر پھوئی پھوئی کر کے اپنی شہرت اور نیک نامی کا تالاب بھرا ہوگا اور دن رات ایک کر کے لوگوں کے دلوں میں گھر کیا ہوگا اور اس ایک چھوٹے سے حادثے سے وہ سارے دلوں سے نکل گیا ہوگا۔ ہر یاد سے محو ہو گیا ہوگا۔ اس دل سے بھی جس نے اسے جنم دیا ہوگا۔ اس دل سے بھی جس نے اسے سچ مچ یاد کیا تھا اور اس دل سے بھی جس نے اسے فائدہ اٹھانے کے لیے دلی محبت کی تھی۔

تیسرے چوتھے روز اتوار کے دن حلقہ ارباب ذوق ادبی میں میرے لیے ایک قرارداد تعزیت پاس کی جائے گی۔ عین اسی وقت حلقہ ارباب ذوق سیاسی میں بھی ایک قرارداد تعزیت پیش کی جائے گی۔ سب متفقہ طور پر اسے منظور کریں گے، لیکن اس کے آخری فقرے پر بحث کا آغاز ہوگا کہ حلقہ ارباب ذوق کا یہ اجلاس حکومت سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ مرحوم کے لواحقین کے لیے کسی وظیفے کا بندوبست کیا جائے۔ اس پر حاضرین دو گرہوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک اس کے حق میں ہوگا کہ یہ فقرہ رہنے دیا جائے کیونکہ مرحوم ایک صاحب حیثیت ادیب تھا اور اس کی اپنی ذاتی کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں موجود ہے۔ پھر کوٹھی کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔ کچھ اسے دو کنال کی بتائیں گے، کچھ تین کنال کی، کچھ دبی زبان میں کہیں گے کہ اس کی بیوی پڑھی لکھی خاتون ہے، وہ نوکری بھی کر سکتی ہے اور لکھنے لکھانے کے فن سے بھی آشنا ہے۔ ریڈیو آنے جانے والے ایک ادیب سامعین کو بتائیں گے کہ بانو کی ذاتی آمدنی ریڈیو ٹی وی سے دو ہزار سے کم نہیں۔ میرے ایک دور کے رشتہ دار ادیب اعلان کریں گے کہ وہ ایک مالدار گھرانے کا فرد تھا اور اس کا اپنے باپ کی جائیداد میں بڑا حصہ ہے جو اسے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ پھر کوئی صاحب بتائیں گے کہ ورثا کو بورڈ سے گریجوایٹی بھی ملے گی۔

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد دن ہفتوں مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہونے لگیں گے اور میری پہلی برسی آجائے گی۔ یہ کشور ناہید کے لیے آزمائش کی گھڑی ہوگی کیونکہ ہال کی ڈیٹس پہلے سے بک ہو چکی ہوگی

اور میری برسی کے روز آل پاکستان ٹیکنیکل سکولز کے ہنر مند طلبہ کا تقریری مقابلہ ہوگا۔ کشور کو پاکستان بھر میں میری برسی نہ منا سکنے کا دلی افسوس ہوگا اور وہ رات گئے تک یوسف کامران کی موجودگی میں کف افسوس ملتی رہے گی۔ لوگ اس کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کو ایک ایشو بنا لیں گے اور وہ لوگ جو عمر بھر مجھے جائز طور پر ناپسند کرتے رہے تھے وہ بھی کشور ناہید کے برخلاف دھڑے میں شامل ہو جائیں گے۔ مجھ سے محبت کی بنا پر نہیں کشور کو ذلیل کرنے کی غرض سے۔ پھر ذوالفقار تابش کی کوششوں سے گلڈ کے بڑے کمرے میں یہ تقریب منائی جائے گی اور عتیق اللہ، کشور بیدل، ریاض محمود، غلام قادر، سلیم افراط مجھ پر مضمون پڑھیں گے۔

کس قدر دُکھ کی بات ہے کہ زمانہ ہم جیسے عظیم لوگوں سے مشورہ کیے بغیر ہم کو بھلا دے گا۔ میں ہوا، نپولین ہوا، شہنشاہ جہانگیر ہوا، الفرج رونی ہوا، ماورالنہر کے علماء ہوئے، مصر کا ناصر ہوا، عبدالرحمٰن چغتائی ہوا کسی کو بھی ہماری ضرورت نہ رہے گی اور اتنے بڑے خلا، پانی میں پھینکے ہوئے پتھر کی طرح بھر جائیں گے۔ ہماری اتنی بڑی قربانیوں کا کہ ہم فوت ہوئے اور فوت ہونا کوئی آسان کام نہیں لوگ یہ صلا دیں گے۔ افسوس زمانہ کس قدر بے وفا ہے اور کس درجہ فراموش کار ہے [''سفر در سفر'' سے اقتباس۔]

☆☆☆

اشفاق احمد ——— ایک داستان گو

اس سے ذرا آگے ایک دکان میں گارڈینیا نام کا ریستوران ہوا کرتا تھا۔ نیم روشن، ٹھنڈا، ٹھنڈا ریستوران۔۔۔ بہت کم گاہک اندر بیٹھے ہوتے، بیرے چل کر میز کے پاس آتے تو ان کی آواز تک نہ آتی تھی۔ یہ ریستوران بھی ختم ہوگیا۔ وقت کی آندھی اُسے بھی اڑا کر لے گئی۔ ہم ریگل سینما کا چوک کراس کر کے ''داستان گو' والی ذیلی سڑک پر آئے تو یہاں گزرنے کے لیے جگہ ہی نہیں تھی۔ میں نے اشفاق سے کہا۔

''گاڑی ریگل سینما کے احاطے میں لگا دو یہاں سے پیدل چلتے ہیں۔''

اس نے یہی کیا۔ ریگل سینما کے باہر اگر کوئی شے ویسی کی ویسی تھی تو وہ پھول بیچنے والوں کی۔ گلاب، گیندے اور دوسرے رنگ برنگ پھولوں سے بھری ہوئی بالٹیاں تھیں۔ آج سے چالیس سال پہلے بھی ان پھول بیچنے والوں کے پاس کوئی دکان نہیں تھی۔ ریگل سینما کے گیٹ کے باہر پھولوں کی ٹوکریاں اور بالٹیاں سجا کر بیٹھے رہتے تھے اور آج بھی وہ اسی طرح فٹ پاتھ پر بیٹھے پھول بیچ رہے ہیں۔ ریگل سینما کے گیٹ کی دوسری طرف جہاں اب کتابوں کی دکان ہے کبھی شیراز ریستوران ہوا کرتا تھا۔ یہاں کبھی کبھی میں اور اشفاق آ کر چائے پیا کرتے تھے۔ پھر اس کا نام پالز کیفے ہوگیا۔ اس کا مالک پال نام کا ایک بھاری بھرکم باکسر ٹائپ آدمی ہوا کرتا تھا۔ جو شام کو ریستوران کے باہر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ دوسری کرسی پر ٹانگیں پھیلا دیتا اور مال پر کبھی کبھی گزرنے والی موٹر کاروں کو تکتا رہتا۔ پھر نہ جانے وہ کہاں غائب ہوگیا۔ اس کے ساتھ سفید ساڑھی اور اُداس چہرے والی ایک خاتون بھی بیٹھا کرتی تھی۔ وہ بھی پھر نظر نہیں آئی۔ اس کے آگے ایک بڑا اسٹور ہے۔ یہاں پہلے سٹینڈرڈ ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں پہلے پہل انجیلا نام کی ڈانسر ڈانس کیا کرتی تھی۔ انجیلا بعد میں میٹرو ہوٹل میں ڈانس کرنے لگی تھی۔

سٹینڈرڈ ہوٹل میں شراب کے جام بھی چلتے تھے۔ شراب سے مجھے یاد آ گیا۔ گوالمنڈی کے چوک میں ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد ہم یہاں آئے تو میں نے دیکھا کہ اس ہوٹل کے باہر ایک بورڈ لگا تھا جہاں اُردو میں لکھا ہوا تھا۔

''یہاں بیٹھ کر شراب پینے کی اجازت ہے۔''

اسی طرح جی پی او کے سامنے لائیڈز بنک والی بلڈنگ کے اوپر بہت بڑا نیون سائن لگا تھا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

''مری بیئر بہترین بیئر ہے۔''

اَب نہ وہ مری کی بیئر رہی، نہ سٹینڈرڈ ہوٹل رہا، نہ سٹینڈرڈ ہوٹل کی ڈانسر انجیلا رہی، جو رہی تو بے خبری رہی۔

ہم پھول بیچنے والوں کے پھولوں سے جدا ہو کر ''داستان گو'' دفتر کے سامنے والے بس سٹاپ پر آ کر ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اشفاق ہنس پڑا۔

''یار! ہمارا چھوٹا سا شاہ نشیمن ٹائپ کا دفتر تو بالکل ہی ویران ہو گیا ہے۔''

وہاں خدا جانے کس نے اپنا دفتر یا دفتر کا گودام بنایا ہوا تھا۔ دفتر کی تنگ سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ یہ سیڑھیاں دوسری منزل پر روزنامہ ''آفاق'' کے دفتر کو بھی جاتی تھیں۔ یہ 1952ء کی بات ہے میں روزنامہ ''آفاق'' کے دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔ پہلے میری ڈیوٹی دن کے وقت اخبار کے دوسرے تیسرے صفحے پر ہوا کرتی تھی۔ میرے ساتھ ناصر کاظمی اور علی سفیان آفاقی بھی ہوا کرتے تھے۔ ''آفاق'' اخبار میں آفاقی کے نام سے کالم لکھا کرتا تھا۔ پھر میں رات کی شفٹ میں چلا آیا۔ یہ ختم نبوت کی تحریک کا زمانہ تھا جب مال پر بڑی گولی چلی تھی۔ رات کو کرفیو لگتا تھا۔ میں نے پاس بنوا رکھا تھا۔ پھر بھی رات کو ایک بجے گھر واپس جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کسی طرف سے کوئی گولی نہ آ جائے۔ اشفاق نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر کہا۔

''چلو یار! واپس چلتے ہیں۔ ان کھنڈروں میں کب تک پھرتے رہیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی ایک تاریخی کھنڈر کی سیر باقی ہے۔''

''وہ کونسا کھنڈر ہے''؟

''پاک ٹی ہاؤس۔''

اشفاق بے اختیار خوش ہو کر بولا۔

''ہاں یار! وہاں ضرور چلیں گے۔ چلو۔''

ہم نے گاڑی نکالی اور پاک ٹی ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ پاک ٹی ہاؤس کے سامنے جو درخت تھا وہ پہلے سے بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی گھنی شاخوں نے سڑک پر سایہ کر رکھا تھا۔ ٹی ہاؤس بھی زبان حال سے اپنی خستگی و شکستگی کی داستان سنا رہا تھا۔ فرش کی ٹائلیں جہاں سے اکھڑ گئی تھی وہاں پلستر پھیر دیا گیا تھا۔ چند ایک میزوں پر اجنبی چہروں والے لوگ بیٹھے تھے۔ سراج صاحب کے بیٹے نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ کاؤنٹر چھوڑ کر ہمارے پاس آیا۔ اس کا چہرہ وفورِ مسرت سے چمک رہا تھا۔

''زہے نصیب کہ آپ پاک ٹی ہاؤس میں آئے۔''

میں نے کہا۔

''یار! چائے وہی پرانے پاک ٹی ہاؤس والی پلانا۔''

''اس سے بھی اعلیٰ چائے آئے گی۔''

پھر اس نے کسی بیرے کو آواز دی۔ بیرا آ گیا۔ کسی پرانے بیرے کی صورت اس میں نظر آ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ لال نامی بیرے کا بیٹا ہے۔ وہ بڑے اہتمام سے چائے بنا کر لایا، مگر یہ وہ چائے نہیں تھی جو بھی ہم وہاں پیا کرتے تھے۔ اشفاق شیشے کی دیوار والی سیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں یاد ہے یہاں شہرت بخاری، قیوم نظر، حبیب جالب، انجم رومانی اور امجد الطاف بیٹھا کرتے تھے۔''

ہم کاؤنٹر کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔

''اور یہاں ناصر کاظمی میرے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ بیٹھتا وہ بھی قیوم نظر والی ٹولی میں تھا مگر جس روز اس نے تازہ غزل کہی ہوتی تھی تو مجھے ساتھ لے کر اس میز پر آ جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہوتی تھیں۔ وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ لگا کر مجھے کہتا تمہیں اپنی تازہ غزل سناتا ہوں۔۔۔''

میں نے اوپر گیلری کو جاتے زینے کو دیکھا۔ زینہ خالی تھا اوپر گیلری بھی خالی تھی۔ زینے کے پاس بھی ایک میز لگی تھی۔ مجھے یاد آ گیا۔ ایک بار گرمیوں کی دوپہر کو میں اس میز پر بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ شہرت بخاری، قیوم نظر اور محمود جیلانی نامی ایک سٹوڈنٹ بھی تھا جس کا تعلق منٹگمری سے تھا اور جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا اور گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں ہی رہتا تھا۔ محمود جیلانی بڑا ادب پرست نوجوان تھا۔ اتنے

میں پاک ٹی ہاؤس کا دروازہ کھلا اور سعادت حسن منٹو نے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ منٹو صاحب کی زندگی کے آخری افسوسناک ایام تھے۔ یہ منظر پورے کا پورا مکمل تفصیل کے ساتھ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ شہرت بخاری نے منٹو صاحب کو دیکھا تو گھبرا کر کہا۔

''اوئے منٹو صاحب آ گئے، بھاگو، وہ پیسے مانگیں گے۔''

قیوم نظر اور شہرت بخاری جلدی سے اُٹھ کر اوپر گیلری میں چلے گئے۔ میں اور محمود جیلانی وہیں بیٹھے رہے۔ اس دوران منٹو صاحب ہماری میز پر پہنچ گئے تھے۔ غالباً وہ محمود جیلانی کو دیکھ کر وہاں آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی محمود جیلانی سے پوچھا۔

''تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟''

محمود جیلانی نے بڑے ادب سے بٹوہ کھول کر اُن کے آگے رکھ دیا اور کہا۔

''منٹو صاحب! یہ سارے پیسے آپ ہی کے ہیں۔''

مجھے یاد ہے بٹوے میں دس روپے کے کتنے ہی نوٹ ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ منٹو صاحب نے ان میں سے صرف دو نوٹ نکال کر رکھ لئے اور کہا۔

''بس بیس روپے کافی ہیں۔''

اور جن قدموں سے چل کر وہاں آئے تھے، انہیں قدموں سے چلتے ٹی ہاؤس سے باہر نکل گئے۔ ان دنوں جمخانہ شراب کا ادھا چودہ روپے میں آیا کرتا تھا۔ ہم دیر تک ٹی ہاؤس میں بیٹھے گزرے زمانے کو، گزرے ہوئے زمانے کے چہروں کو یاد کرتے رہے۔ کیسے کیسے لوگ تھے۔ کیسے کیسے چمکیلے چہرے تھے جو ادب کے آسمان پر ستارے بن کر چمکے اور پھر اپنے پیچھے روشنی کی لکیریں چھوڑ کر نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے۔ کبھی ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھے گلدان میں نرگس اور گلاب کے پھول مہکا کرتے تھے۔ شیشے میں ان پر سردیوں کی دھوپ پڑتی تو وہ بجلی کے بلب کی طرح روشن ہو جاتے۔ اب کاؤنٹر پر نہ گلدان ہے نہ گلدان کے پھول ہیں۔ صرف میں اور اشفاق احمد میز کے آمنے سامنے سر جھکائے بیٹھے پرانے دنوں کو یاد کر رہے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ اس میز پر کوئی اور بیٹھا ہمیں یاد کر رہا ہوگا۔ (اے حمید کی یادداشتوں سے اقتباس)

☆☆☆

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں

اپنے دوست دلدار کی موت پر اشفاق احمد کی ایک یادگار تحریر

دلدار کی موت سے ایک عجیب عقدہ کھلا ہے کہ آدمی جب میری عمر کو پہنچتا ہے تو اُسے بہت زیادہ ٹیک لگانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو پھر کئی عقدے خواہ دیر سے سہی اس پر کھلتے ضرور ہیں۔ عمران خان جیسا آدمی بہت خوش قسمت ہے کیونکہ وہ عقدے جو میری عمر تک جا کر کھلتے ہیں اس پر ابھی سے کھل گئے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ پچھلے دنوں یہ سب کہا گیا کہ دلدار بھٹی فوت ہونے کے بعد اپنے پیچھے خلاء چھوڑ گیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ جب میں فوت ہوں گا یا کوئی اور دوست احباب تو وہ اپنے پیچھے خلاء ضرور چھوڑ جائیں گے۔ جو آدمی بڑی محنت کرتا ہے، بڑی قرینے کی زندگی بسر کرتا ہے ہر وقت کرانڈے کی سولی اپنے ساتھ رکھتا ہے اور بڑے دھیان سے زندگی بسر کرتا ہے وہ شخص دنیا کی منڈی میں اپنی ذات کا سودا خود لگا کر خود ہی بیوپاری ہوتا ہے اور خود ہی آڑھتی ہوتا ہے اور خود ہی خریدار وہ آدمی جب دنیا سے جاتا ہے تو اپنی ذات کی منڈی سجائی ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے پیچھے ایک خلاء ضرور چھوڑ جاتا ہے مگر دلدار بھٹی جیسا آدمی جاتا نہیں ہے کیونکہ اس نے جس بے ساختگی کے ساتھ زندگی بسر کی، جیسے پھول کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ خوشبو بکھیر رہا ہے اور اپنے پیچھے بھی خوشبو چھوڑ گیا ہے بلبل گاتا ہے تو اس نے کبھی پرواہ نہیں کی کہ وہ جھگی پر بیٹھ کر گا رہا ہے یا پرائم منسٹر ہاؤس میں۔ وہ اپنی بے ساختگی سے بس گائے چلا جاتا ہے تو ایسے لوگ جو بے ساختہ اچھے کام کرتے رہیں پیچھے کبھی خلا نہیں چھوڑ کر جاسکتے۔ وہ موجود ہیں پہلے سے زیادہ موجود۔

دلدار بہت عظیم انسان تھا ایک ایسا انسان جسے ساری عمر نہیں بھولا جا سکتا۔ وہ نہ ہوتے ہوئے بھی ہم سب کے درمیان ہے۔ گو میں اس کے ساتھ زیادہ نہیں رہا کیونکہ میری اور اس کی ساری عمر نہیں بنی۔ میں

وہ شخص ہوں جس کے ساتھ وہ جھگڑتا رہا۔ ہر ایک سے محبت کرتا تھا مگر میرے ساتھ اس کا رویہ بچوں جیسا تھا میں چونکہ ایک ضدی خودسر بوڑھا ہوں اور اپنے کیٹیگوریکل خیالات کا اظہار کرتا رہتا ہوں تو وہ اکثر میرا گھٹنا پکڑ کر کہتا کہ بابا جی مان جائیں۔ تھوڑی سی بات بدل لیں۔ میں کہتا بس دفع ہو جاؤ جو میں نے کہہ دیا صحیح کہہ دیا۔ لیکن آخر وہ جیت جاتا تھا اور مجھے منا کر اس سختی سے اس زعم سے نکال لیتا تھا جس میں میں پھنسا ہوتا تھا اور غلط ہوتا تھا وہ ایسے لوگ جن کے لیے میں امر کا لفظ استعمال نہیں کرتا پتہ نہیں اس کے لیے کیا لفظ ہوں، بس وہ ہوتے ہیں اور ہوتے ہی چلے جاتے ہیں۔ دو روز پہلے جب لوگ دلدار کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے جمع ہو رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ بہت سے چہرے میرے لئے اجنبی ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید رات ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی آشنا چہرہ نظر نہیں آ رہا۔ مگر دوسرے روز جب دن کے وقت دلدار کی رسم قل کے لئے مخلوق خدا جمع ہوئی تو میں صرف ایک تہائی احباب کو پہچان سکا اور حیران ہوتا رہا کہ باقی سب لوگ کہاں سے آئے۔ دلدار نہ تو وزیر تھا نہ امیر صرف اور صرف استاد اور کمپیئر تھا تو پھر اس کے چاروں طرف اس قدر بکھرے ہوئے چہرے کہاں سے آئے۔ ایک دوست سے معلوم ہوا کہ وہ صرف لاہور کے باشندے نہیں یہ تو شیخوپورہ، گوجرانوالہ، فیصل آباد اور قصور سے آئے ہوئے لوگ ہیں اور اگر امریکا سے آئی ہوئی دلدار کی میت اور نماز جنازہ میں چوبیس گھنٹے کا وقفہ ہوتا تو پورے پنجاب سے لوگ آتے۔ دلدار درحقیقت پورے پاکستان کا دلدار تھا۔ زندگی کی خوبصورتیاں جمع کر کے چاروں طرف بانٹنے والا شخص تھا۔ وہ صاحب فن تھا۔ انسانی رشتوں سے محبت اور شگفتگی اس کی پہچان تھی۔ ہر دلعزیز تھا مگر دلعزیزی کی بھی ایک حد ہوتی ہے لیکن اس کی ہر دلعزیزی تمام حدیں پھلانگ گئی۔ اس کا ماتم کرنے والوں میں ہمارے معاشرے کا ہر طبقہ شامل تھا۔ وہ طبقہ بھی جو ٹی وی نہیں دیکھ سکتا اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ دلدار کی شخصیت میں وہ کونسی خاصیت تھی کہ مائیں، بوڑھے، جوان بیٹے بیٹیاں، سب اس کو اپنا سمجھتے تھے اس قدر اپنا کہ اس کی میت پر اتنے بے شمار لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

مجھ سے دلدار کا رشتہ احترام اور محبت کا تھا۔ وہ جب بھی مجھ سے ملا ہاتھ ملانے سے پہلے میرے گھٹنوں کو ضرور چھوتا۔ شگفتہ گفتار اور بذلہ سنج تھا بلا کا حاضر دماغ تھا مگر اسی دماغ کی شریان پھٹ جانے سے وہ ہم سے الگ ہوا۔ معروف مزاحیہ کردار کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے مزاحیہ کردار ادا کرنے کی یہ وجہ بتائی تھی کہ وہ کھل کر رونا چاہتا ہے۔ یہ دلدار کے معاملے میں بھی درست تھا۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا اور ایک مشترکہ دوست کے بارے میں پوچھنے لگا کہ کل آپ ان کی بہن کی شادی میں شرکت کرنے گئے تھے میں

نے کہا ہاں پھر وہ اپنے خاص حلقے کے لوگوں کے بارے میں بھی دریافت کرنے لگا اور جب میں بولا کہ صرف میں ہی تھا۔ اس کے بعد وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ میں نے اسے لپٹا لیا اور بہلانے کی کوشش کی مگر وہ بڑی بڑی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گراتا رہا اسے گلا تھا کہ اس کے دوست نے جب سب کو بلا رکھا تھا تو پھر اسے کیوں نہیں بلایا اور پھر میں نے سوچا کہ اس شخص کے سینے میں دل کی جگہ خوشبوئیں بھری ہیں۔ وہ یہ خوشبو چاروں طرف بکھیرتا ہے اور سب کو خوش کر کے خود کو بھی خوش کرتا ہے۔ اب سب لوگ اس کے لیے رو رہے ہیں۔ لیکن صرف اس کی یادیں ہیں جو اس کے رونے والوں کو بہلا سکتی ہیں کیونکہ انہیں بہلانے والا ایسے وقت میں ان سے بچھڑا ہے جب انہیں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔

☆☆☆

وہ تو ایک زمانہ تھا

اشفاق احمد بھی روٹھ گیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے یوں اچانک چلے جانے سے دنیا کتنی سونی ہو جائے گی اور اس سے محبت کرنے والوں کے دل کتنے ویران، کتنے خالی خالی ہو جائیں گے۔ جانے اسے کیا جلدی تھی؟ ابھی تو کہانی ایسے موڑ پر پہنچی تھی کہ سارا مجمع گوش بر آواز تھا کہ داستان گو خاموش ہو گیا۔ سننے والے جانے کب تک پتھر بنے رہیں گے اور ان میں پھر سے جان ڈالنے والے شہزادے کی سواری جانے کب ادھر سے گزرے گی؟

وہ عجب شخص تھا۔ افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، شاعر، سکرپٹ رائٹر، دانشور، حکیم، فلسفی، صوفی، داستان گو، سفر نامہ نگار لیکن اس کی یہ ساری حیثیتیں رنگ و بو کے مرقعے کی طرح اس کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھیں۔ بہت کچھ لکھنے اور بہت کچھ بولنے کے باوجود اس کی ذات میں عجب طرح کی پُر اسراریت تھی اور یہی اسرار اس کی شخصیت کا اعجاز تھا۔ 1980ء کی دہائی میں مجھے ریڈیو والوں نے ڈرامے لکھنے پر ڈال دیا۔ میرے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ چھپا تو اشفاق صاحب نے کمال شفقت سے اپنے تاثرات قلمبند کیے۔ اس مجموعے میں شامل ایک ڈرامے ''یہ کہانی ختم ہوئی'' کا موضوع محبت تھا۔ دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ایک ملاقات میں ان کی کتابوں کا ذکر چلا تو میں نے کہا ''اشفاق صاحب! آپ کی بیشتر کتابیں میں نے پڑھ رکھی ہیں لیکن ''سفر در سفر'' مجھے بے حد پسند آئی۔ اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اشفاق صاحب مسکرائے اور بولے ''سفر در سفر'' پڑھنے والوں کی نہیں، لکھنے والوں کی کتاب ہے۔'' کوئی ہفتہ بھر بعد ڈاکیا ایک پارسل لایا۔ کھولا تو اس میں ''سفر در سفر'' کے تازہ ایڈیشن کا ایک نسخہ تھا۔

کتاب کے پہلے صفحہ پر خوشخط الفاظ میں لکھا تھا:

''عزیز گرامی، عرفان صدیقی کے لیے، جس نے ریڈیو ڈرامے کی روایت کو بڑا سہارا دیا ہے۔

اشفاق احمد 8 فروری 1990ء''۔

'سفر در سفر' میرے سامنے رکھی ہے اور میں لفظوں کے بانجھ پن کا شکار ہوں کہ کیا لکھوں۔ اشفاق احمد کے بارے میں ''مکتب فکر'' کا لفظ تو بہت ہی چھوٹا لگتا ہے، اس کوہ قامت شخص کے سامنے ''دبستان'' کا لفظ بھی بونا دکھائی دیتا ہے۔ اُسے ایک ''عہد'' کہتے ہوئے بھی تشنگی نہیں بجھتی۔ وہ تو ایک 'زمانہ' تھا۔ صدیوں پر محیط زمانہ۔

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے، نہ رات

یہ کوئی بارہ چودہ برس پہلے کی بات ہے، میں لاہور آیا ہوا تھا کہ میری ایک پرانی شاگرد مجھے ملنے آ گئی۔ وہ ان دنوں ایک مقامی ہسپتال میں بطور ڈاکٹر تعینات تھی۔ باتوں باتوں میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ایک اچھے خاندان کے شریف النفس ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن سخت گیر والد آمادہ نہ ہو رہا تھا۔ وہ خاندانی روایت اور محبت کی تنی رسی پر چل رہی تھی اور والدین سے بغاوت نہ کرنا چاہتی تھی۔ پھر وہ اچانک بولی ''آپ اشفاق احمد کو جانتے ہیں؟ میں نے کہا ''ہاں جان پہچان ہے'' وہ بڑی لجاجت سے بولی 'سر پلیز مجھے ان کے پاس لے چلیں، میں سب کچھ انہیں بتا کر ان سے رہنمائی لینا چاہتی ہوں۔'' میں محبت کی آگ میں پگھلتی لڑکی کو اشفاق صاحب کے ہاں لے گیا۔ داستان سرائے کے لان میں تین کرسیاں ڈال دی گئیں۔ ڈاکٹر نے کتھا شروع کی اور ''داستان گو، ایک مودب سامع کی طرح پتھر کا بت بن گیا۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا کہ محبت میں جنوں کی حدوں کو چھو لینے والی یہ معصوم لڑکی، ایک انتہائی مصروف انسان کے سامنے کیا کہانی لے بیٹھی ہے۔ دیر بعد اس نے درد کی لمبی حکایت ختم کی تو میں اشفاق صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اب وہ حکیمانہ تلقین کی صندوقچی کھولیں گے، ان کے اندر کا داستان گو چوکڑی مار کر بیٹھ جائے گا اور داستان سرائے کے عین اوپر منڈلاتی شام مرصع کشیدہ کاری والا گھگھرا پہن کر گہری سبز رنگ گھاس پر اترے گی تو نوجوان لڑکی دیکھتے دیکھتے سنگ مرمر کی گڑیا بن جائے گی، لیکن اشفاق نے سر کھجایا اور لڑکی کی طرف دیکھے بغیر مجھ سے مخاطب ہوئے ''عرفان یار کچھ کرنا پڑے گا'' اور پھر اس نے ایسا کچھ کیا کہ ساری مشکلیں دور ہو گئیں۔ ڈاکٹر کے والدین نے اسے اپنے ہاتھوں ڈولی میں بٹھا کر رخصت کیا اور آج وہ اپنی محبت کی ہمسفری میں تین خوبصورت بچوں کے ساتھ امریکہ میں رہ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اشفاق احمد کی موت نے اسے اُداس کر دیا ہو گا اور اُسے ''داستان سرائے'' کی وہ دل

گرفتہ سی شام ضرور یاد آئی ہوگی۔

اشفاق، پاکستانیت میں گندھے گداز کا نام تھا۔ وہ اپنی تہذیب وثقافت کے رنگوں سے سجا ایسا تھا جس کے منقش درودیوار کی ہر ہر بیل، ہر ہر بوٹے میں اپنے پن کی پچی کاری دکھائی دیتی تھی۔ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو خدا ماننے والے دانشوروں کا جی بھر کا مضحکہ اڑایا۔ اس نے مغرب کے طلسم کا شکار بیمار ذہنوں کے مقابلے میں توانائی قومی خودی کو اس انداز سے پیش کیا کہ بے سمت اور بے مہار "ترقی" تہمت بن کر رہ گئی۔ اشفاق احمد نے اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنی بوباس، اپنی لوک دانش اور اپنے پرکھوں کی میراث کو اس عمدگی سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں میں سمویا کہ ان کا اسلوب ایک منفرد حیثیت اختیار کر گیا۔ ایسا اسلوب جس میں اپنے پہاڑوں کی گونج، اپنے چشموں کا ترنم، اپنی فصلوں کی لہلہاہٹ اور اپنی بہاروں کا نکھار رچا بسا ہے۔ اس کا قاری اس کے اسلوب کی جادونگری سے نکلنے کے سارے راستے بھول جاتا ہے۔ اشفاق قدامتوں کے غاروں میں بیٹھا جدت پسند تھا۔ "تلقین شاہ" اس کی اسی انفرادیت کا نمونہ تھا۔ ریڈیائی پروگرام بیالیس سال تک گھروں، گلیوں، مجلسوں اور چوپالوں کا موضوع بنا رہا خود اپنی ذات پر برسانے والا "تلقین شاہ" شاید آنے والے کئی سالوں میں بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے۔

اشفاق احمد کے جانے سے بھرا پڑا پاکستان خالی سا دکھائی دینے لگا ہے۔

جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے

اک سکوتِ مضمحل گاڑی گزر جانے کے بعد

"سفر در سفر" کے ایک باب میں اشفاق احمد نے اپنی موت کے بعد کے منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ میں درد اور گداز میں ڈوبے یہ صفحات بیسیوں مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ آج پھر میں نے اشفاق صاحب کا بھیجا ہوا نسخہ نکالا اور خود اپنے تازہ زخم پر نمک پاشی کرنے لگا۔ اشفاق لکھتا ہے:

"میں اپنی موت کے غم میں دُکھ سے اس قدر بھر گیا کہ میرے آنسو نکل آئے یعنی میرے مرنے کے بعد کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ لاہور کا نیا ریڈیو سٹیشن اسی طرح چلتا رہے گا؟ کتنے ظلم کی بات ہے۔ لوگ ریڈیو سٹیشن کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے نہیں لگ جائیں گے اور میری کمی محسوس نہیں کریں گے؟ ضرور کریں گے۔ میرے دل نے کہا اور مجھے بڑی تسلی ہوئی۔ باہر کے لوگوں کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن لاہور کے لوگ اس کمی کو ضرور محسوس کریں گے۔ شدت سے کریں گے پھر دیر تک کرتے رہیں گے۔ شاید کئی سالوں تک۔ بہت ممکن ہے ساری عمر۔ میں تو کئی حلقوں کا محبوب

ہوں۔ قارئین کا محبوب، سامعین کا محبوب، ناظرین کا محبوب۔۔۔ یہ سب لوگ میرے بغیر کس طرح زندہ رہ سکیں گے اور راتوں کو سونے سے پہلے آہیں بھرے بغیر اپنے اپنے بستر جھاڑ کر اور اپنے تکیے سیدھے کر کے آرام سے کیسے سوجایا کریں گے بھلا۔۔۔؟''

استاد امانت علی خان فوت ہوا تو فلمی اداکار اجمل نے اشفاق احمد سے پوچھا ''بھاجی! ایہہ دسو کہ امانت مرکیوں گیا؟''

اشفاق نے کہا۔۔۔''اجمل صاحب! آرٹسٹ مرتا نہیں روٹھ جاتا ہے۔ معاشرہ آرٹسٹ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی ضدیں بھی پوری کرتا ہے لیکن معاشرے کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے ''مجھے ایک کوزہ لے دو۔ کچی مٹی کا کوزہ اور معاشرہ فوراً اسے کوزہ فراہم کر دیتا ہے۔ پھر آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے ''مجھے ایک ہاتھی لے دو'' اور معاشرہ فوراً اپنی تمام جمع پونجی جمع کر کے اسے ایک ہاتھی لے دیتا ہے۔ پھر آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے ''اس ہاتھی کو اس کوزے میں ڈال دو۔'' اس وقت معاشرہ مجبور ہو جاتا ہے اور آرٹسٹ روٹھ جاتا ہے اور منتا نہیں اور چلا جاتا ہے۔''

اشفاق سے تو معاشرے نے ٹوٹ کر پیار کیا۔ وہ کہتا تو اس سے عشق کرنے والے لوگ ہاتھی کو کوزے میں ڈالنے کی بھی کوئی صورت نکال لیتے لیکن وہ تو کچھ بولا ہی نہیں۔ کوئی ضد ہی نہیں کی۔ بلا وجہ روٹھ گیا اور بھرا میلہ چھوڑ کر اتنی دور چلا گیا کہ اسے آواز بھی نہیں دے سکتے۔ مجھے لاہور والوں کا پتہ نہیں کہ اشفاق سے خالی شہر انہیں کیسا لگ رہا ہے اور وہ کس حال میں ہیں لیکن ایک عجیب سا احساس میرے دل پر انگارے کی طرح دھرا ہے کہ میں کل رات بھی سونے سے پہلے آہیں بھرے بغیر اپنا بستر جھاڑ کر اور اپنا تکیہ سیدھا کر کے آرام سے سو گیا تھا اور شاید آج رات بھی ایسا ہی ہو۔ اشفاق بھی کیا سوچتا ہوگا؟

(عرفان صدیقی)

☆☆☆

بلبل ہزار داستان

جو کالم میں 40 منٹوں میں لکھ لیتا ہوں وہ کالم لکھتے ہوئے مجھے کئی دن گزر گئے ہیں مگر وہ مجھ سے نہیں لکھا جا رہا!

میں نے ہیوسٹن سے اپنے گھر فون کیا تو عمر بیٹے نے بتایا کہ اشفاق احمد انتقال کر گئے ہیں اور اس کے بعد اسے امریکہ میں مقیم پاکستانی دوستوں کے فون آ رہے ہیں اور ہر کوئی یہ خبر اس انداز سے سنا رہا ہے جیسے وہ مجھ سے اس خبر کی تردید سننے کا خواہش مند ہو، مگر خبریں تو وہی صحیح نکلتی ہیں جو اپنے اندر گھرے دکھ اور لمبی اُداسی کا سامان لئے ہوں! سو یہ خبر بھی درست ہے۔ اشفاق احمد انتقال بھی کر گئے ہیں اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں انہیں منوں مٹی تلے دفن بھی کیا جا چکا ہے۔ یہ مٹی بھی کتنی بے خبر ہے اس کی بھبت اُڑانے والے اس کے سینے پر مونگ دلتے پھرتے ہیں اور اسے خاک شفا سمجھنے والے اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے والے اس کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے ہیں۔ آنکھیں انہیں ڈھونڈتی ہیں کان ان کی آواز سننے کو ترستے ہیں ہونٹ انہیں چومنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے اور ان کے درمیان کتنے ہی پردے حائل ہو گئے ہیں۔ چراغ رخ زیبا بھی لے کر نکلیں تو وہ ہمیں نظر نہیں آئیں گے۔ بس انہیں دیکھ لیا جتنا دیکھنا تھا۔

اشفاق احمد بظاہر ہماری ہی طرح کے ایک عام انسان تھے، یعنی ہنستے بولتے تھے، چلتے پھرتے تھے، کھاتے پیتے تھے مگر وہ ہم جیسے کہاں تھے۔ مجھے تو کبھی کبھی شبہ گزرتا تھا کہ وہ ایک جن ہیں اور انسانی شکل میں ہمارے درمیان رہتے ہیں یا ایک عامل ہیں جو بڑے سے بڑے جن کو قابو میں کر کے اسے اپنا معمول بنانا جانتے ہیں۔ ''گڈریا'' جیسا شاہکار افسانہ لکھنے والا شخص جب ایک عام آدمی کے لیے لکھنے بیٹھتا تو اشفاق احمد سے تلقین شاہ بن جاتا، اس نے دانشوروں کو بھی اپنی دانش سے زیر کیا اور وہ عام انسانوں کو گر

تہہ دام لایا۔ اس نے ٹی وی کے لیے ''ایک محبت سو افسانے'' اور ''اور ڈرامے'' لکھے تو عوام وخواص دونوں کو متاثر کیا ''زاویہ'' شروع کیا تو ان سے اختلاف رکھنے والے بھی پوری دلچسپی سے یہ پروگرام دیکھتے رہے۔

اشفاق احمد ادبی وثقافتی تقریبات میں اظہار خیال کے لیے لب کھولتے تو بڑے بڑے لسان ان کے سامنے گونگے نظر آنے لگتے۔ دوستوں کی محفل میں ہوتے تو ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' ایسی کیفیت نظر آتی۔ اشفاق اور بانو آپا گھر پر ضیافت کا اہتمام کرتے تو منظر ایک دفعہ پھر بدل جاتا۔ اشفاق احمد لان میں کباب بنا رہے ہوتے اور بانو آپا باورچی خانے میں روٹیاں پکا رہی ہوتیں۔ وہ ایسے مواقع پر بزرگوں کے اندر کا بچہ بھی جگانے کی کوشش کرتے، چنانچہ ایک دفعہ ایک ایسی ضیافت کے موقع پر ''میوزیکل چیئر'' کا کھیل بھی کھیلا گیا۔ اس موقع پر کیسے کیسے ثقہ دانشوروں کو بچوں کی طرح میوزک رکنے پر کرسی کی طرف جھپٹے دیکھا گیا۔

اور میں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ عید کے روز میں اپنے بیٹوں یاسر، عمر اور علی کے ساتھ اشفاق احمد اور بانو آپا سے ملنے ماڈل ٹاؤن لاہور میں ان کی رہائش گاہ ''داستان سرائے'' گیا تو تھوڑی دیر بعد تین ملنگ اندر داخل ہوئے۔ ہاتھوں میں کڑے، گلے میں مالا، جسم پر سیاہ چادر۔ آتے ہی اشفاق احمد کے پاؤں میں بیٹھ گئے اور اپنے اس گرو کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیں۔ مجھے علم تھا کہ اشفاق احمد کے عقیدت مندوں میں بہت اضافہ ہو چکا ہے لیکن یہ علم نہیں تھا کہ باقاعدہ پیری مریدی کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے مگر یہ پیری مریدی وہ نہیں تھی جس کے بدنما مظاہر ہمیں اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ جو چیلے اشفاق احمد کے قدموں میں بیٹھے تھے ان میں ایک یحییٰ خاں نام کا چیلا بھی تھا جو جہاں گرد ہے اور کتابوں کا مصنف بھی ہے۔ گرو اور چیلے کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ بہت وکھری ٹائپ کی تھی۔ اشفاق احمد کا تصوف عام ڈگر سے ہٹ کر تھا اور ان کے چیلے بھی اپنے رویئے میں عام ڈگر سے ہٹے ہوئے تھے۔

اشفاق احمد بنیادی طور پر داستان گو تھے ان کے ڈرامے، ان کی گفتگو، ان کے بابے، تقریروں میں پیش کئے جانے والے ان کے اعداد و شمار یہ سب ان کی داستان گوئی ہی کا حصہ تھے۔ وہ ہر بات تخلیقی سطح پر کرتے تھے۔ اور اسے ڈرامائی موڑ دیتے تھے چنانچہ عام اخباری رپورٹر ان کی جو تقریر رپورٹ کرتے وہ اصل روح سے مختلف ہوتی۔ اشفاق احمد پہ اس حوالے سے بہت اعتراضات ہوتے مگر وہ ''کج شہر دے لوک وی ظالم سن، کج مینوں مرن دا شوق وی سی'' کے مطابق اگلے ہی دن کوئی اور ''متنازعہ'' بات کہہ دیتے حالانکہ ان کی باتوں سے جزوی اختلاف تو ممکن تھا مگر بنیادی اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اگر وہ کہتے تھے کہ پاکستان کو پڑھے لکھے لوگوں نے برباد کیا ہے تو ان میں کون سی بات غلط تھی۔ اس کی معاشی پالیسیاں

داخلہ پالیسیاں اور خارجہ پالیسیاں آکسفورڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے ''ٹیکنو کریٹس'' ہی بناتے رہے ہیں کسی نتھو خیرے نے تو یہ پالیسیاں نہیں بنائیں۔ یا اگر وہ کہتے تھے کہ کاشتکار، ترکھان لوہار، موچی کو ان پڑھ نہ کہو کیونکہ اپنے شعبے میں ان کا علم ان شعبوں کے کسی پی ایچ ڈی سے کم نہیں ہے۔ تو اس میں بھی اختلاف کی کہاں گنجائش تھی؟ اسی طرح مغربی تہذیب و تمدن پر تابڑ توڑ حملوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ شاید اس تہذیب کے قابل قدر پہلوؤں سے انکاری ہیں۔ شاید ایسا نہیں تھا۔ وہ غالباً صرف بے پناہ مرعوبیت کو کم کرنا چاہتے تھے ممکن ہے ان کی سوچ یہ ہو کہ ایک انتہائی سوچ کو دوسری انتہائی سوچ کے ذریعے معتدل بنایا جا سکتا ہے تاہم اس حسن ظن کے باوجود مجھے اس سلسلے میں ان سے کم کم ہی اتفاق ہوتا تھا۔

آخر میں مجھے ان کی اس ''وصیت'' کا ذکر کرنا ہے جس کا اظہار انہوں نے ایک دفعہ میرے سامنے کیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد ان کی قبر پر ڈھول کی تھاپ پر درویش رقص کریں، میرے خیال میں اگر وہ یہ بات نہ بھی کہتے ان کے عقیدت مندوں نے یہی کرنا تھا وہ بہت برسوں سے ریاضت اور عبادت کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ ان کی دانش انہیں اسلام اور پاکستان سے محبت سے روکتی نہیں تھی۔ ان کی بعض تشریحات سے اختلاف ممکن تھا مگر ان کا وجود ان بدنیت دانشوروں کے لیے ایک چیلنج بن چکا تھا جو اسلام کی ضد میں پاکستان کی نفی بھی کرتے ہیں۔ اگر چہ اس میں بہت سا تصور اسلام کے ان نام نہاد داعیوں کا بھی ہے جو ڈنڈا ہاتھ میں لئے ہر اس شخص کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کے اسلام کی تعبیر سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اسلام کو وسیع معنوں میں ایک سیکولر مذہب سمجھتا ہے۔ اشفاق احمد تمام مذاہب کا دل سے احترام کرتے تھے۔ بہت سے مذاہب کے بانیوں کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ قرآن میں ایک لاکھ چوبیں ہزار پیغمبروں میں سے صرف چند ایک کا ذکر آیا ہے چنانچہ ممکن ہے یہ ہستیاں بھی اللہ کی فرستادہ ہوں اور ان کے پیروکاروں نے ان کی تعلیمات کی شکل مسخ کر دی ہو۔ میں نہیں جانتا اس وسیع المشرب انسان کا جسد خاکی کس قبرستان میں دفن کیا گیا ہے اور وہاں درویشوں نے ابھی علم لہرائے ہیں کہ نہیں اور انہوں نے پاؤں میں گھنگھرو باندھے ہیں کہ نہیں مگر میرے کانوں میں اس بلبل ہزار داستان کے وجد آور نغموں کی تھاپ ابھی سے سنائی دے رہی ہے اور میری روح ان پر رقص کرنے کے لیے بے چین ہے! (عطاء الحق قاسمی)

☆☆☆

کاش اشفاق احمد جیسی کوئی اور شخصیت ابھرتی نظر آئے

میری یاد میں فیض صاحب کے بعد تخلیقی شخصیات میں شاید اُردو انگریزی الیکٹرونک میڈیا عوام اور سرکاری منصب داروں نے کسی اور کا ایسا سوگ نہیں منایا۔ اشفاق کو جاننے والے اور اسے رونے والے کروڑوں تو ہو ہی چکے ہوں گے۔ پرسوں سے اب تک اس کے متعلق ریڈیو، ٹی وی تمام اُردو اخبارات بیشتر بھارتی میڈیا بھی سینکڑوں پروگرام نشر کر چکا اور کر رہا ہے۔ وہ اس آدھے یا پورے ایک اظہاریے یا ایک دو کتابوں میں سما جانے والی شخصیت نہیں، اس کا پھیلاؤ کئی سمندروں سے بھی زیادہ ہے۔ مجھے تیس پینتیس برس سے اس سے چند فکری اختلاف رہتے تھے مگر انہوں نے ہماری پینتالیس سالہ دوستی پر ذرا منفی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ شاید نہیں غالباً نہیں یقیناً ایک بڑا آدمی تھا۔ عمر میں مجھ سے صرف ایک برس بڑا۔ فضائل میں کم از کم لاکھوں گنا زیادہ۔ کیا گنواؤں، کیا نہ گنواؤں، تیس سال سے زیادہ ریڈیو پر ایک مسلسل براڈ کاسٹ کیا جس میں وہ تلقین شاہ نام کا کردار ادا کرتا تھا یہ کردار منجملا منافقت اور دو غلے پن کا نمائندہ تھا جو ہوتا کچھ ہے، تلقین کچھ کرتا ہے، چونکہ اس کی زبان من موہنی تھی اور اُردو پنجابی کے الفاظ اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے اس لیے سننے والے کی مجال نہ تھی کہ پروگرام ختم ہونے سے پہلے اسے سننا بند کر دے۔

پھر ٹی وی ڈراموں میں تو اس نے (اور سچ کہ ساتھ ہی بانو قدسیہ نے) ایک طرح ہی نئی ڈالی، کیا؟ انہوں نے بہترین جی ہاں بہترین، تفریحی ''یعنی عناصر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ مقصدیت آمیز کرنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ابن انشاء جو ایک زمانے میں اپنے کالموں کے حوالے سے مارک ٹوین M. Twin کی ذہنی غلامی میں چلا گیا تھا (ٹوین کا مقولہ: خبردار جو اپنی تحریر کو کسی مقصدیت سے آلودہ

ہونے دیا) اشفاق اور قدسیہ کی ''مقصدیت زدگی'' پر معترض ہوتا۔ اثبات میں ہی گردن ہلاتا رہتا۔ اس کے ٹی وی ڈرامے نہ جانے کتنے ہو چکے تھے ساتویں دہائی میں تو ٹی وی اسکرین پر وہ اور بانو قدسیہ ہی چھائے ہوئے تھے مگر بانو کے سیریل کم ہوتے تھے اشفاق کے زیادہ (1) ایک محبت سو افسانے (2) اور ڈرامے (3) طوطا کہانی (4) منچلے کا سودا (5) اُچے برج لاہور دے سیریل (6) کارواں سرائے (7) قلعہ کہانی (8) حیرت کدہ (9) ننگے پاؤں لانگ پلے (10) ٹاہلی تھلے ریڈیو پروگرام (35) سال تک چلنے والے ''تلقین شاہ'' کے علاوہ (46) مکمل ڈرامے اور (329) فیچرز اور چھوٹے ڈرامے ۔۔۔ اور سب کو اعلیٰ یعنی معیاری کہلاتے تھے۔ (میں نے سب نہیں دیکھے، سب نہیں سنے مگر سب سے یہی رائے سنی) اور اس کے اوائل تحریر ہی کی ایک عظیم تخلیق، محض ایک افسانہ ''گڈریا'' آج بھی اسی شوکت و عظمت اور پیغام کے ساتھ زندہ ہے۔ کیا پیغام ۔۔۔ میں نے غالباً 51-1950ء میں خود منٹو صاحب کو اپنے خاص تیکھے، سرپرستانہ، انداز میں کہتے ہوئے اوئے اشفاق احمد تو گڈریا جیسے دو افسانے لکھ گیا تو تیرا حشر خراب کردوں گا۔ اشفاق بہت ذہین آدمی تھا مگر ڈرا۔ ''کیوں سر کیا بات ہے؟'' ''اوئے پھر میرا کیا ہوگا، اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار تو میں ہی ہوں نا'' ۔۔۔ ''اس میں کیا شک ہے ہم دونوں نے بمشکل اپنے خوف کی چادر سے سر نکال کر کہا۔۔۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی شادی کب ہوئی یہ مجھے یاد نہیں ۔ یہ بقول کسی ایک کی پسند کی شادی تھی۔ دونوں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مصروف تھے۔ ملے، ایک دوسرے کو جانا پہچانا اور شادی کر لی۔ اشفاق فیروز پور کے ایک نامور پٹھان خاندان کا مہاجر تھا۔ بہت صحت مند۔ میں نے اسے غالباً 1951ء میں دیکھا ہے۔ اس وقت لاہور میں چار مشاہیر نوجوان خوبصورت ترین کہلاتے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، اشفاق احمد، منیر نیازی اور فلمی دنیا میں سنتوش کمار (مسلمان تھے، مجھے ان کا اصل نام یاد نہیں رہا) لیکن ان سب میں اشفاق احمد طرح دار سب سے زیادہ تھا۔ مجھ ناچیز کو بھی اس پر سخت رشک آتا تھا۔ شاید اسی سبب سے میری اس کی ملاقات دوستی میں نہ بدل سکی۔ یوں بھی وہ نثر کا آدمی، میں نام نہاد شاعر۔ مجھے ناصر کاظمی کی صحبت زیادہ اچھی لگتی تھی۔ منیر نیازی کی جوانی بھی افسانوی ہیروز کی یاد دلاتی تھی، زبان اس وقت بھی نہیں رُکتی تھی، آج بھی نہیں رکتی۔ جسے جب جو چاہے بآواز بلند کہہ دیتے ہیں۔ میں اور میری یاد میں کوئی ان کی باتوں کا برا نہیں مانتا۔

اشفاق نے پاکستان میں بھی پڑھایا روم جا کر اُردو پڑھائی اور اٹالین میں ڈپلومہ لیا۔ پروفیسر ابزنو بوزانی اس سے بہت سینئر تھے مگر اُردو کے عاشق اور طالب علم۔ دونوں میں ایک لازوال دوستی قائم ہو گئی۔

(شاید پروفیسر صاحب اب بھی زندہ ہیں)۔ مجھ سے دوستی گلڈ نے کرائی۔ وہ ہمارے پہلے انتخابات میں (1950) میں مغربی پاکستان ریجن کا سیکرٹری منتخب ہوگیا۔ مگر اس نے میری توقعات کے مطابق کام نہیں کیا۔ شاید وہ مجھ جیسوں کے چھوٹے چھوٹے انتظامی مطالبات کو ذرا اہمیت نہیں دیتا تھا، پھر جلد ہی گلڈ کے اگلے انتخابات آ گئے یعنی تاسیس سے چھ مہینے کے اندر اندر اس وقت اس نے پروفیسر وقار عظیم صاحب کے لئے مخلصانہ کنویسنگ کی اور جب وہ منتخب ہوئے اپنا جریدہ ''داستان گو'' چلانے میں مصروف ہوگیا۔ ممکن ہے وہ اس وقت بھی تصوف کا آدمی ہو مگر مجھ پر ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ ہم دوست نہ تھے اعزازی شرکائے کار تھے اور ہمارے درمیان جناب قدرت اللہ شہاب ایک مضبوط پل کے طور پر قائم تھے۔ ہماری بعض خاصی سخت زبانی آویزشیں ان کی موجودگی میں ہوئی ہیں مگر ان کا انجام ہمیشہ شہاب صاحب کی مشفقانہ مسکراہٹوں پر ہوا ہے۔ وہ چپ بیٹھے ہماری بحثیں سنتے رہتے۔ بانو چولہے کے آگے بیٹھ کر ہمارے لئے بیسنی پراٹھے پکاتی اور حسب فرمائش کٹھی میٹھی لسی پلاتی میری بیوی بانو کے خوبصورت بال گوندھتیں دونوں ظہر تا مغرب نمازیں ساتھ پڑھتیں اور ہماری لڑائی کا مذاق اڑاتیں۔۔۔ ''داستان گو'' پر اس نے بڑی محنت کی مگر وہ تجارتی طور پر ناکام ہوگیا۔ پھر، نہ جانے کس سال اس نے ایک تجارتی طور پر ناکام فلم بنائی جس کی دیدہ ور لوگ تعریف بھی کرتے رہے۔ پھر وہ چند مہینے مزید ہفتہ وار ''لیل و نہار'' رہا، وہ کسی خاص مکتب فکر سے وابستہ نہ تھا اس نے ''لیل و نہار'' (پاکستان ٹائمز گروپ مارشل لا کی زد میں آنے کے بعد) میں بھی مدیری کی اور مدتوں بعد بھٹو صاحب مرحوم کو گرا دینے والے مارشل لا کے دور میں کسی بوگس قسم کی سرکاری مشیری بھی کی مگر یہ سب سیاست سے اس کے غیر سنجیدہ رویوں کی نشانیاں تھیں۔ بنیادی طور پر وہ سیاسی آدمی نہیں تھا گو سیاسی ادیبوں کے عتاب کا نشانہ بنتا رہتا تھا۔۔۔ ہاں جواب کم کم دیتا تھا۔ وہ تو اپنے اس مرض الموت کو موت تک سے چھپا کر رکھتا تھا۔

اُردو بورڈ ایک کارنامہ:

اُردو بورڈ لاہور 1962ء میں دراصل شریف تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کے نتیجے میں قائم ہوا تھا جس کا مقصد لاہور میں فروغ اُردو کا ایک سرکاری ادارہ قائم کرنا تھا۔ اللہ بخشے شریف صاحب وفاقی ایجوکیشن سیکرٹری بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے خوش نہیں تھے مگر ان سے لڑ بھی نہیں سکتے تھے (بابائے اُردو کے آخری ایام) وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اُردو کے سب کام مولوی صاحب کی فوقیت اور ان کی مرضی کے مطابق

چلیں۔ میں نے ان کے تیور اور طاقت اور مولوی صاحب کی بڑھتی ہوئی ناطاقتی دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کہ ایک انجمن قسم کا سرکاری ادارہ لاہور میں بھی قائم کر دیں جس میں وہ اپنی پسند کے افسران لا سکتے ہیں۔ اس کی تائید مصالح ملکی کی بنا پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی مرحوم نے بھی کی جو شریف کمیشن کے نائب صدر اور حیدر آباد کے شیخ الجامعہ تھے۔ ہم نے ڈھاکہ میں بھی بنگلہ اکادمی کے ہوتے ہوئے ایک بنگلہ بورڈ قائم کرنے کی سفارش کی تھی، زیادہ انجمنوں میں زیادہ تنخواہ دار کارکن بھی چھپ جاتے ہیں اور قسمت اچھی ہو تو زیادہ تعداد اچھے رضا کاروں کی بھی دستیاب ہو جاتی ہے۔ اس اُردو بورڈ کے پہلے ڈائریکٹر مخدومی کرنل مجید ملک بنائے گئے جب اس وقت سری لنکا میں پریس منسٹر تھے مگر ناخوش۔ اعزازی صدر مسٹر جسٹس عبدالرحمن جن کی اُردو دوستی اور فضیلت کے بابائے اُردو بھی قائل تھے۔ بہر حال اُردو بورڈ (اب سائنس بورڈ) کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ 1967ء تک اس بورڈ نے کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ 1967ء کے اوئل میں جب شہاب صاحب اپنا جبریا اور سفارت ختم کر کے ہالینڈ سے واپس آ کر وفاقی معتمد تعلیم بنے تو انجمن ترقی اُردو کے حالات خراب ہونے کے باوجود ہم (بہ سرپرستی مخدومی و معظمی جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو) اُردو اقامتی کالج اب وفاقی اُردو یونیورسٹی کا کلیہ سائنس) بنانے میں مصروف تھے۔ میں نے شہاب صاحب سے عرض کی کہ اُردو بورڈ بن ہی چکا ہے تو اسے ایک توانا اور متحرک ٹیم دے کر اُردو کے کام کو اپنے ہم انجمن اُردو کے لیے صرف انجمن پر ہی آپ کی مالیاتی محدودات کی آزمائش نہیں کرنی چاہیں گے (وزارت مالیات آج کی طرح اس وقت بھی اُردو کو اس کا حق دینے پر تیار نہ ہوتی تھی مقتدرہ بنی نہیں تھی) شہاب صاحب اور اشفاق احمد کی دوستی معروف تھی مگر اشفاق انہیں امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ شکر ہے کہ میں دونوں کی ہچکچاہٹ پر حاوی آیا اور اشفاق احمد نے اپنے اعزازی اور محترم پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کی عملی رہنمائی میں کمال پر کمال کر دکھایا۔ یقیناً اس نئے بورڈ کے بعض اراکین بڑے دانشمند اور فاضل لوگ تھے۔

پیر حسام الدین راشدی، ممتاز حسن، ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ اور۔۔۔ میں بھی حاضر وہاں۔۔۔ مگر اشفاق کی محیر العقول محنت کے بغیر بورڈ بہترین کتابیں (بلوغ الارب فی لسان العرب از علامہ شکری آلوسی) چچ نامہ ہفت زبانی لغت وغیرہ) چھاپنے کے باوجود وہ کچھ نہ بن پاتا جو وہ آج ہے۔ اشفاق نے وہ کیا جو کسی ایسے سرکاری ادارے سے آج تک ممکن نہیں ہوا ہے۔ اس نے کتابوں (زیادہ سائنسی کتابوں) کے منافع سے کسی سرکاری امداد کے بغیر لاہور میں پل کے نیچے ایک معقول عمارت کھڑی کر دی جس میں

اب بورڈ واقع ہے، اس کام کی مشکلات اور اہمیت صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ایسی شدید محنت اور کامیاب منصوبہ بندی کے امتحان میں شریک بھی ہوئے ہوں ورنہ باتیں بنانے کا حق تو بنیادی انسانی حقوق کی رو سے سب کو ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتداً عرض کیا تھا اشفاق کی تخلیقی صفات، محنتیں اور سیرت کتابوں کی مستحق ہے میرے تو جو منہ میں آیا کہہ گیا ہوں۔ وہ ایک حیرت انگیز طور پر ہمہ صفات تخلیقی شخصیت تھا۔ میں اس کے تصوف اور تبلیغی انداز کو یا تو سمجھتا نہیں تھا یا اسے سمجھنے کے قابل نہیں۔ (میرا مسئلہ اپنے اتنے بڑے محبوب محسن جناب قدرت اللہ شہاب صاحب کے ساتھ بھی یہی تھا جس نے مجھے ان کے معاملے میں گنگ کر رکھا ہے) میں، شہاب، اشفاق اور مفتی مثلث کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ جان کر یقین کے ساتھ کچھ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ تینوں اچھے انسان تھے انسانوں کا بھلا چاہتے تھے اور استطاعت بھر انسانوں کی خدمت بھی کرتے تھے۔ یہ ایک ضرورت سے زیادہ سادہ پانی over simplistic بیان ہے لیکن تا حال مجھ میں اس سے زیادہ کی مقدرت نہیں۔ اس کے نئے ٹی وی ہفتہ وار ''زاویے'' کے بارے میں بھی میری یہی رائے، گوزاویہ تلقین شاہ کی طرح لاکھوں کروڑوں بے چین ناظرین کو متاثر نہیں کر سکا تھا ایک وجہ یہ بدلتے ہوئے حالات اور فروغ پاتی ہوئی تشکیک بھی ہوگی مگر زاویے کی ذہنی (روحانی) افادیت میں کلام نہیں۔ کاش کبھی اس کی تمام تخلیقات میں اس کی کبھی ڈھکی چھپی کبھی کھلی روحانی مقصدیت پر گفتگو ہو سکے۔ جیا تو کبھی بانو سے پوچھ کر ان لوگوں کے اس پہلو پر بات کروں گا۔۔۔ انشا اللہ۔

اکثر دنیائے ادب و دانش میں بڑی شخصیات کی موجودگی میں ہی انہی کے مقلدانہ سہی انہی جیسی ایک نہ ایک شخصیت ابھرتی ضرور نظر آجاتی ہے۔۔۔ افسوس میں یا میری کم نظری کہ میں اشفاق احمد جیسی دوسری کوئی نوجوان شخصیت ابھرتے نہیں دیکھتا۔ کاش میرے جانے سے پہلے کسی قدر تو ابھر جائے۔ بانو قدسیہ تو یقیناً ان کی جانشین بھی ہے مگر میں مستقبل بعید کی بات کر رہا ہوں۔

اشفاق احمد یقیناً ایک بڑا آدمی تھا (میں دُعا کرتا ہوں کہ مجھے اور بہت کچھ لکھنے کا موقع ملے) خوش بختو! اب مجھے کب بلا رہے ہو۔ یہ اُردو یونیورسٹی اللہ اسے بہت کامیاب کرے مجھے کھا گئی اور مجھے تم سے بہت سی پُرانی پُرانی باتیں کرنی ہیں۔ (جمیل الدین عالی)

☆☆☆

اشفاق صاحب

میر صاحب نے کہا تھا!

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

آج شام کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں ماڈل ٹاؤن ڈی بلاک کے پارک میں رکھی ہوئی ایک چار پائی کے گرد گھیرا کرتی خلق خدا کو دیکھ کر پتہ نہیں یہ شعر کیوں ہمیں بار بار یاد آیا اس دنیا کی تماشاہ گاہ میں کرداروں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے کہ موت اور زندگی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں مگر کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ منظر سے ایک کردار کچھ ایسے Exit کرتا ہے کہ پس منظر اور پیش منظر دونوں ہی دھندلا سے جاتے ہیں ہمارے نزدیک اشفاق صاحب بھی ہماری آپ کی زندگیوں پر مشتمل ایکٹ کے ایک ایسے ہی مرکزی کردار تھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے انہیں پہلی بار ہم نے اپنے فلیمنگ روڈ والے مکان کے قریب واقع شبیر پان والے کی دکان پر دیکھا تھا ان کے ساتھ اے حمید تھے جوان دنوں ایک ملحقہ گلی میں رہتے تھے دونوں حضرات اتنے خوش رو اور جامہ زیب تھے کہ وہ اس ماحول میں کچھ اوپرے اوپرے سے لگتے تھے۔ ہم سکول کے آخری سالوں میں تھے چنانچہ جب کسی نے بتایا کہ یہ دونوں منفرد نظر آنے والے شخص مشہور ادیب ہیں تو ہم نے فوراً فیصلہ کیا کہ سکول کی لائبریری میں سے ان کی کتابیں لے کر پڑھیں گے تا کہ پتہ چل سکے کہ یہ کیا اور کیسا لکھتے ہیں، کیونکہ اس وقت تک ہمارے آئیڈیل اور پسندیدہ ترین ادیب صرف دو تھے شفیق الرحمن اور ابن صفی۔ سکول کی لائبریری سے ان کی کتابیں طلب کرنے پر لائبریرین نے ہمیں جن نظروں سے دیکھا وہ آج تک ہمارے ذہن پر نقش ہیں کچھ ٹھیک سے یاد نہیں کہ سب سے پہلے ہم نے اشفاق صاحب

کی کون سی تحریر پڑھی لیکن ہمارا تاثر کچھ کچھ ویسا ہی تھا جس کا اظہار مولانا حالی نے ایک گورے افسر کی تقریر کے حوالے سے کچھ یوں کیا تھا کہ

اے بزم سفیران دل کے سخن آرا
برخورد وکلاں تیری مفاہمت پہ فدا ہے
کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے
ایک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

ہماری نارسائی یا کم فہمی کی وجہ تو شاید ہماری عمر اور مطالعے کی کمی تھی لیکن اشفاق صاحب کو ساری عمر بے پناہ مقبولیت کے باوجود جزوی طور پر ایک ایسے ہی ردعمل کا سامنا رہا کہ ان کی فکر اور موضوعات کا انوکھا پن ان کے عہد کی اجتماعی سوچ سے ہمیشہ کچھ قدم آگے ہی رہا اور یوں وہ بھی کچھ حوالوں سے غالب کی طرح ایک ناآخریدہ گلشن کے ہی عندلیب رہے افسانوں میں ''توتے بلے'' سے لے کر طلسم ہوش افزا کی کہانیوں تک اور ڈراموں میں ''حیرت کدہ'' سے لے کر ''من چلے کا سودا'' تک ان کے ابلاغ کی ایک سطح عام قارئین اور ناظرین کے لیے ایک حد تک ایک ایسا ''چیستان'' رہی جس میں کشش اور گریز کی دونوں رویں ساتھ ساتھ چلتی رہیں اور اس بات نے ہمیں ہمیشہ حیران رکھا کہ ایک ہی شخص بیک وقت ''آسان'' اور ''مشکل'' کا ایسا غیر معمولی ماہر کیسے ہوسکتا ہے! جن دنوں ٹی وی پر ان کے ابتدائی ڈرامے ''ٹاہلی تھلے'' اور ''اچے برج لاہور دے'' چلا کرتے تھے ہمارے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن اس سکرین پر ہمارا نام بھی بطور ڈرامہ نگار آیا کرے گا یوں ہماری نسل کے لکھنے والوں کے لیے ٹیلی پلے لکھنے کی ایک ہی ٹریننگ اکیڈمی تھی جس کا نام تھا ''اشفاق احمد۔''

اُن سے بالمشافہ ملاقات خالد آفتاب (جواب ڈاکٹر خالد آفتاب اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں) کے توسط سے ہوئی جو ان کے سگے بھتیجے اور ایم اے او کالج میں ہمارے کولیگ تھے اور جن کے مزنگ والے گھر کے ایک بالا خانے میں ہم طفیل نیازی مرحوم سے اشفاق صاحب کی فلم ''دھوپ اور سائے'' کے گانے سنا کرتے تھے جو ایک ہفتہ چل کر ڈبوں میں بند ہوگئی تھی کہ اپنی چند تکنیکی کمزوریوں سے قطع نظر یہ فلم بھی اپنے وقت سے آگے کی چیز تھی۔

ستر کی دہائی میں ان کی بے مثال ٹی وی سیریز ''ایک محبت سو افسانے'' (جس کی بیشتر کہانیاں ان کے افسانوں پر مبنی تھیں) آن ایئر ہوئیں تو وہ ٹی وی ڈرامے کے حوالے سے آئیڈیل اور رول ماڈل بن

گئے اور ''نکھار'' جیسے پروگراموں کے توسط سے وہ بطور کمپیئر ٹی وی کی محبوب اور پسندیدہ ترین شخصیت سمجھے جانے لگے سو ہماری ان سے نیازمندی تو سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ مگر ہمارے ابتدائی ڈراموں کو ہی انہوں نے جس طرح سے سراہا اور جس قدر محبت اور شفقت سے ہماری سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی اس کا سارا کریڈٹ ان کی خوبصورت اور سایہ دار درخت جیسی شخصیت کو جاتا ہے کہ اس وقت سے لے کر اپنے دم آخر تک ان کی شفقت ہمارے شامل حال رہی اور وہ (بانو آپا سمیت) ہماری ہر کامیابی پر اس طرح خوش ہوتے رہے جیسے ماں باپ اپنے بچوں کی خوشیوں میں خوش ہوتے ہیں۔

اشفاق صاحب کی زندگی طرح طرح کے کارناموں سے بھری پڑی ہے لیکن ہمارے نزدیک ان کی ایک بہت بڑی Contibution (جس کا اعتراف کرنے کی بجائے کچھ حلقوں میں اسے تمسخر کا نشانہ بنایا گیا) اپنے عہد کے انسان کو پورا اور مکمل انسان بننے کا درس دیتا ہے جو طبیعات اور مابعد الطبیعات دونوں کو ساتھ لے کر چلنے والا ہو کہ انسان کی زندگی جانوروں کی طرح صرف جسمانی سطح پر کھانے پینے، افزائش نسل کرنے اور مر جانے تک محدود نہیں ہے۔

اس کا ایک حصہ اس کے اشرف المخلوقات ہونے اور اپنے اس خالق کو ڈھونڈنے اور اس کی منشا کو جاننے سے بھی متعلق ہے جس نے یہ دنیا اور کائنات ایک متعین پروگرام کے حساب سے بنائی ہیں۔ اس کے آخری بیس برسوں کی تحریریں اور تقریریں واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ انسانی زندگی میں ''روحانیت'' کو ہر سطح پر شامل کر کے ایک ایسا ماحول قائم کرنے کی کوشش میں تھے جہاں انسان جسمانی و روحانی زندگی کا ایک بہتر ملاپ حاصل کر سکے۔

تنقید اور مخالفت ہر منفرد اور تخلیقی سوچ رکھنے والے ابن آدم کی ہم قدم ہوتی ہے، سو یہ معاملہ اشفاق صاحب کے ساتھ بھی رہا یہ وقت اس کی تفصیل میں جانے کا نہیں سو ہم اس بات کو کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہوئے اپنے خان صاحب/ بابا جی/ اور تلقین شاہ کو اسی دُعا کے ساتھ رخصت کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان کے لیے آخرت کی ان منزلوں کو آسان فرما دے جس کا حال خود اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ (امجد اسلام امجد)

☆☆☆

لیکچرار سے تلقین شاہ تک

غالباً 1961ء کا ذکر ہے جب جناب اشفاق احمد نے ریڈیو پاکستان کے ارباب بست وکشاد کو ایک ہفتہ وار ریڈیائی پروگرام کا تصور دیا، جس میں اہم کردار صرف دو تھے اور وہ بھی مردانہ ۔۔۔ یعنی ایک تو خود تلقین شاہ اور دوسرے ان کا ذاتی ملازم ہدایت اللہ۔ یہ ایک طنزیہ اور مزاحیہ پروگرام تھا، جس کے ذریعے معاشرے کی بدنمائیوں کا اظہار اور اصلاح متصور تھا۔ متعلقہ افسران کا خیال تھا کہ یہ پروگرام ہو سکتا ہے مگر ایک یا دو ہفتے سے زیادہ چلنے کے امکانات معدوم ہیں۔ اشفاق صاحب نے کہا کہ آزمانے میں کیا حرج ہے۔ چنانچہ محض آزمائشی طور پر یہ پروگرام نشر کیا گیا مگر ہوا یہ کہ تلقین شاہ براعظم ایشیا کا نمبر ون، دنیا کا دوسرے نمبر پر آنے والا سب سے طویل ریڈیائی فیچر قرار پایا۔

جب ٹیلی ویژن نہیں تھا اور لوگ ریڈیو کے رسیا ہوا کرتے تھے، تلقین شاہ سننے کے لیے ہوٹلوں اور چائے خانوں میں لوگوں کا ہجوم ہوا کرتا، تلقین شاہ کے جملے لوگوں کا تکیہ کلام بن جاتے اور محفلوں میں گونجتے رہتے۔

اس پروگرام کے ذریعے اشفاق احمد نے جو اس وقت لیکچرار تھے نہ صرف معاشرے کی خرابیوں اور خامیوں پر بڑے فنکارانہ انداز میں تنقید کی بلکہ کشمیر کاز کے لیے بھی زبردست جدوجہد کی اور بھارت میں پاکستان کی جن شخصیات کا سب سے زیادہ ''احترام'' پایا جاتا تھا، ان میں تلقین شاہ بھی شامل تھے۔ تاہم ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار مجھے جناب اشفاق احمد نے بتایا کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل ایک ممتاز اداکار تھے، ماسٹر جینت جو عوام میں بے پناہ مقبول تھے۔ وہ اداکار امجد خاں کے والد تھے اور انتہائی خوبصورت۔ ان کی کار پر پردے لگے ہوتے تھے کہ اس کے بغیر ان کا سفر کرنا ممکن نہ تھا، لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا، اگر کسی نے ان کی ایک جھلک دیکھ لی، تو مہینوں نشے میں رہتا۔ میں ان دنوں کالج میں پڑھتا تھا اور ہم سب اس کے بے حد مداح تھے۔ پاکستان بن گیا تو وہ ماسٹر جینت بھارت چلا گیا۔ اشفاق